

جنرل ”ٹائیگر نیازی“ سے
جنرل ”انور نیازی“ تک
محمد شکور طفیل کا محاکمہ

فائل

نامہ ماہ
مختار

فروری ۲۰۱۹ء

اس شمارے میں

- 1 - کلامِ غالب میں طنز و مزاح کا عنصر --- نام و ر شاعر و نقاد مظفر حنفی کا تنقیدی تجزیہ
- 2 - اردو کی غیر روایتی تائیدی آواز --- بھارت سے ہمیدہ ریاض کے فکروفن پر حمیرا حیات کا انداز تجزیہ نگاری
- 3 - خلوص اور دوستی کا شفاف آئینہ --- سابقہ شمارے کے تسلسل میں علی اصغر عباس پر حامد یزدانی کی خصوصی تحریر
- 4 - امریکی سپر پاور کے کس بل نکل گئے --- محسن فارانی کا انداز فکر و نظر

گوشہ خاص: قدیر شیدائی

ماہنامہ ”فانوس“ کے بانی مدیر اور نام و ر شاعر قدیر شیدائی کے فکروفن پر
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شہزاد احمد، نوید صادق اور محمد شکور طفیل کے تجزیات
قدیر شیدائی کی شخصیت کے آئینے میں یعقوب پرواز اور خالد علیم کی تحریریں
قدیر شیدائی کے مجموعہ کلام کی تدوین و تزئین
محمد شکور طفیل کے قلم سے

Monthly Fanoos
Since 1960

مجلس مشاورت

حفیظ الرحمن احسن، عطاء الرحمن
رؤف طاہر، اشرف سلیم
نوید صادق، نوید صدیقی

بیرون ملک نمائندگان

منیر احمد خلیلی — متحدہ عرب امارات
حامد یزدانی — کینیڈا
افضل آرش — سعودی عرب
تکلیل سرور — امریکہ
شہناز رحمان — بھارت

قانونی مشیران

توصیف احمد (ایڈووکیٹ)
ارشاد گوندل (ایڈووکیٹ)

مدیرِ اعلیٰ

مدیرِ منتظم

مدیر

نائب مدیر

مدیرِ معاون

مدیرِ معاون

سرکولیشن
مینینجر

مارکیٹنگ
مینینجر

کمپوزنگ

ڈیزائننگ

محمد شکور طفیل

زوبیہ شکور

خالد علیم

محسن فارانی

ندیم سرور

مدرِ تقدیر

محمد ظفر اقبال

0324-4782746

0344-4157745

محمد اعظم

خاقان خالد

حمدان خالد



فانوس

رجسٹرڈ نمبر : L : 7480

جلد: ۵۹ --- شماره نمبر: ۲ --- فروری ۲۰۱۹ء

عام شماره: قیمت: 50 روپے سالانہ: 1000 روپے

(بیرون ملک: 100 امریکی ڈالر)

(سالانہ چندہ میں ڈاک خرچ اور خاص اشاعتوں کی اضافی قیمت بھی شامل ہے)



ماہ نامہ فانوس لاہور

6، نور چیمبرز، بنگالی گلی، گنپت روڈ، متصل اردو بازار، لاہور

info@tufailpublications.com monthlyfanoos1960@gmail.com

0092-042-37353305

www.caarwan.com

محمد شکور طفیل نے دلاور حسین خاں، مطبع ڈی ایچ پرنٹرز، پیسہ اخبار، لاہور سے چھپوا کر
6، نور چیمبرز، بنگالی گلی، گنپت روڈ، متصل اردو بازار، لاہور سے شائع کیا

ناشر:



مقالات

- ✽ کلام غالب میں طنز و مزاح کا عنصر ۱۰۱ مظفر حفیظ
- ✽ اردو کی غیر روایتی تائیش آواز: فہمیدہ ریاض ۱۰۷ حمیرا حیات
- ✽ یادنامہ علی اصغر عباس ۱۱۲ سید حامد یزدانی
- ✽ فکر و نظر امریکی سپر پاور کے کس بل نکل گئے ۱۲۱ محسن فارانی
- ✽ فانوس نما جزل ”ٹائیگر نیازی“ سے جزل ”انور نیازی“ تک ۱۲۴ محمد شکور طفیل

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



فہرست

اداریہ

شعاعیں

خالد علیم ۵

قدیر شیدائی: منکروفن

- ✽ قدیر شیدائی کی ”مہکار“ ۶ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
- ✽ عکس تحریر ۷ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا
- ✽ شعور خود آگہی ۸ شہزاد احمد
- ✽ قدیر شیدائی اور ”یوتاؤس“ کی حکومت: ایک تاثر ۱۰ سالار مسعودی
- ✽ قدیر شیدائی کی غزل ۱۲ نوید صادق
- ✽ قدیر شیدائی کی غزلوں کا اجمالی جائزہ ۱۹ محمد شکور طفیل

یادنامہ قدیر شیدائی

- ✽ قدیر شیدائی: کچھ یادیں ۲۹ یعقوب پرواز
- ✽ --- یادوں کی دھنک رہ جاتی ہے ۳۱ سید حامد یزدانی
- ✽ قدیر شیدائی: یادوں کی برکھا ۳۶ خالد علیم

نگارشات قدیر شیدائی

- ✽ ”مہکار“ ---- (کلام قدیر شیدائی) ۵۳ مرتبہ: محمد شکور طفیل
- ✽ منتخب اداریات ”فانوس“ ۸۵ قدیر شیدائی
- ✽ وادی کشمیر اور خانوادہ خوشی محمد ناظر ۸۸ قدیر شیدائی

شعاعیں

ماہ نامہ ”فانوس“ کی ابتدا اس کے بانی مدیر قدیر شیدائی (مرحوم) کے ذریعے ۱۹۶۰ء میں ہوئی۔ اپنی خداداد ادبی صلاحیتوں کے ساتھ انھوں نے کئی گراں قدر شماروں سے اس مجلے کو وقار بخشا۔ عام شماروں کے جلو میں ”مری نمبر“، خوشی محمد ناظر نمبر“ اور ”مقدمہ عبدالعزیز خالد نمبر“ ان کی مدیرانہ حساسات میں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں بعض شماروں میں ”ہمارے شاعر“ کے عنوان سے کئی نوجوان شعرا کو متعارف کروایا۔ ان کی اکیڈمک تعلیم تو کچھ زیادہ نہ تھی لیکن اردو ادب کا لائق اعتبار حد تک مطالعہ تھا اور شعر فنی اور شعر گوئی میں اپنا خاص ذوق رکھتے تھے۔ بعض مشکلات کے باعث ”فانوس“ ان کی زندگی ہی میں ان کی وفات سے چار پانچ سال قبل اپنے اشاعتی تسلسل سے محروم ہو چکا تھا، تاہم ان کے ہونہار فرزند مدثر قدیر نے اسے باقاعدہ جاری رکھنے کے لیے جناب محمد شکور طفیل کے نام منتقل کر دیا۔ یوں ”فانوس“ کی اشاعتوں کا ایک دوسرا دور شروع ہوا اور اس دور ثانی میں اب تک اس کے چالیس سے زیادہ شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں بعض خاص نمبر بھی شامل ہیں۔

دور ثانی کی اشاعتوں میں خاص نمبروں کے علاوہ شعر پر خصوصی گوشے شائع کرنے کا سلسلہ برقرار رکھتے ہوئے بعض اہم شعرا کے فنون پر مشتمل تحریریں اور ان کا منتخب کلام بھی شائع کیا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ قدیر شیدائی اس کے بانی مدیر ہونے کے علاوہ ایک نغمہ گو شاعر تھے اور ان کے کلام کا مجموعہ تاحال تنہا اشاعت تھا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ان کا تمام کلام ایک گوشے کی صورت میں شائع کر دیا جائے، لہذا اس شمارے میں قدیر شیدائی کے فنون پر مشتمل مضامین کے بعد دو چار ہنگامی نوعیت کی تخلیقات کے سوا ان کا مکمل کلام، جو غیر مرتب شکل میں موجود تھا، مدیر اعلیٰ جناب محمد شکور طفیل کے حُسن ترتیب سے شامل اشاعت کر لیا گیا ہے۔ دریں صورت اس بار نظم اور غزل کا حصہ مؤخر کرنا پڑا۔

یہ شمارہ ابھی پریس چھپنے کے لیے تیار ہی تھا کہ قدیر شیدائی مرحوم کی کچھ اور تحریریں بھی دست یاب ہو گئیں۔ ضخامت کے اعتبار سے ان سب کو شامل کرنا ممکن نہ تھا لہذا ان میں سے ایک مضمون ”وادئ کشمیر اور خانوادہ خوشی محمد ناظر“ کو شامل کر لیا گیا ہے اور ساتھ ہی ان کے دو عدد اداریے بھی اس گوشے کا حصہ بنا لیے گئے ہیں۔ اب یہ گوشہ سو صفحات کو محیط ہے اور مجموعی ضخامت کی نسبت سے ”قدیر شیدائی نمبر“ کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم ”مقالات“، ”فکر و نظر“ اور ”فانوس نما“ حسب معمول شامل اشاعت ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ اس بار یہ تمام مشمولات بالخصوص مقالات کو بھی اس شمارے کے آخری حصے میں شامل کرنا پڑا۔ ہم آپ کی معتبر آرا کے منتظر ہیں۔

خالد سلیم

قدیر شیدائی : فنون

اصل نام: امین الدین
 قلمی نام: قدیر شیدائی
 تاریخ پیدائش: ۱۱ مئی ۱۹۳۹ء
 تاریخ وفات: ۱۲ مئی ۲۰۰۴ء (بہ عمر ۶۴ سال)

تصنیف و تالیف:

دیوتاؤں کی حکمت (تاریخ و تمدن) مطبوعہ ۲۰۰۱ء
 نونخ آمون (مقدمہ و تہذیب) مطبوعہ ۲۰۰۲ء
 مہکار (مجموعہ غزل) غیر مطبوعہ

دیگر ادبی خدمات:

ادارت: ماہ نامہ ”فانوس“ بطور مدیر اعلیٰ و ناشر ۱۹۶۰ء تا ۲۰۰۴ء

قدیر شیدائی نے غزل کی صنف کو اپنے تجربات کے اظہار کے لیے منتخب کیا ہے۔ ان کے زیر نظر مجموعہ کلام ”مہکار“ کا سرسری مطالعہ بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہے کہ انھیں صنف شاعری پر پورا عبور حاصل ہے۔ اگرچہ ہم عصر شعری رجحانات کی جھلکیاں ان کے ہاں موجود ہیں لیکن مجموعی تاثر دیگر شعرا سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ پیچیدہ اسالیب کے شائق نہیں ہیں۔ سادہ بیانی میں اپنے ذاتی تجربات و احساسات کی آمیزش کر کے شعر کول نشیں بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔۔۔ ان کے ہاں بہت سے شعر جدت اور تازگی کا احساس دلاتے ہیں اور بالعموم زبان و بیان کی لغزشوں سے مبرا ہیں۔۔۔ مصرعوں کی ساخت میں چنگی اور ہنرمندی ہے لیکن تکلف اور تصنع کا شائبہ بھی نہیں ہے۔

میں قدیر شیدائی کے کلام کی چند در چند خصوصیات سے بہت متاثر ہوا ہوں اور یقین ہے کہ قارئین بھی میرے تاثرات پر مہر تصدیق ثبت کریں گے۔

(ڈاکٹر) خواجہ محمد زکریا



شہزاد احمد

شعورِ خود آگہی

فون 6652731-6650634
21-A / 295 محلہ دالہ پورکینٹ

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

تاریخ 12/5/2023

قدیر شیدائی کا تعلق امرت سر سے ہے۔ امرت سر برصغیر کے شمالی علاقے میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتا تھا۔ اس کے کئی حوالے تھے۔ ادبی ثقافتی، سیاسی، تجارتی اور مذہبی حوالے، مختلف گروپوں میں اس شدت کی کش مکش جاری تھی کہ ہمہ وقت فعال ہونا اس شہر کی پہچان بن گیا تھا۔ ادبی سطح پر اردو اور پنجابی کئی اہم ادیب اور شاعر اس شہر سے تعلق رکھتے تھے اور اس میں مسلمانوں کا حصہ شاید سب سے زیادہ تھا۔ پھر اس شہر کی ایک علمی روایت بھی تھی، اور تقسیم ہند سے کچھ برس پہلے مناظروں اور مباحثوں کی اپنی فضا بھی قائم ہو گئی جس کی کوئی مثال برصغیر کے کسی اور شہر میں موجود نہیں تھی، اگرچہ اسے حمید نے اس شہر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے مگر ابھی اس کے بہت سے گوشے ایسے ہیں جو بے نقاب نہیں ہوئے۔ فسادات کے دنوں میں بھی اس شہر کا ایک خصوصی کردار رہا تھا۔ پہلا مارشل لا بھی اسی شہر میں لگا تھا اور ہجرت کا عمل بھی اسی شہر سے آغاز ہوا تھا۔ ہم اس نگر کو بہت سے امکانات کا مرکز بھی کہہ سکتے ہیں۔

قدیر شیدائی صاحب اسی شہر کے فرزند ہیں، انھوں نے فلمی ثقافت اور ادب و شعر کو آگے بڑھانے میں ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اب ان کی صحت اس قابل نہیں رہی کہ وہ ثقافتی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لے سکیں، لیکن شاعری تو بہر حال ایسی کوئی پابندی قبول نہیں کرتی۔

ادب کے حوالے سے مرزا ادیب مرحوم نے امرتسر کو ایک دبستان قرار دیا تھا، جس کا مطلب میں یہ لیتا ہوں کہ وہاں ادب کی متنوع تخلیقات ایک ہی وقت میں ہو رہی تھیں۔ قدیر شیدائی صاحب تقسیم کے وقت بھی سکول ہی میں تھے، مگر اس شہر کی فضا ان کے اندر رچ بس گئی تھی۔ اگرچہ انھوں نے پاکستان کے نئے امکانات کو خوش دلی سے قبول کیا تھا مگر ایک احساس زیاں کی کک ان کے دل کے اندر باقی رہ گئی تھی، جس کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔

پہلے ہمیں کہاں تھتا شعورِ خود آگہی

لسٹنے لگے تو واقف سود و زیاں ہوئے

ہم نے تو دشمنوں کو بھی چاہا ہے ٹوٹ کر

یادش بخیر! آپ تو پھر جانِ حباں ہوئے

قدیر شیدائی نے امرتسر کو اپنے تجربات کا اظہار کیلئے
منتخب کیا ہے۔ ان کے اردو مجموعہ کلام ”مہر کار“ کے سرسری مطالعہ
کا یہ حصہ نکالے گا یعنی کہ اس میں وہ ضمیمہ شاعری پروردگار
میں حاصل ہے۔ اگرچہ مجموعہ شعری رفاقت کی فصلیں ان کے
میں موجود ہیں لیکن مجموعہ شاعری کے دیگر شعرا سے مختلف اور منفرد
ہے۔ یہ مجموعہ اس لیے نکالنا نہیں ہے۔ سادہ سادگی میں
اپنے ذاتی تجربات و احساسات کی آئینہ کشی کر کے شعر کو دلنشین
نانے کا بہنہ بناتے ہیں۔ ان کے دن بہت سے شعر ہمدرد
اور تاریکی کا احساس دلاتے ہیں اور بالعموم زبان و بیان کی
عمرتوں سے مترا ہیں۔ معروموں کی ساخت میں رکھی اور
بہر ضروری ہے لیکن تکلف اور فصیح کا جائزہ ہی نہیں ہے۔
قدیر شیدائی کے کلام کی چند در چند خصوصیات سے بہت متاثر
ہوا ہوں اور یہیں ہے کہ قالین جس میں سے تانترت لگلا
دیر بہر ضروری بہت کریں گے۔
خدا بہر ضروری

قدیر شیدائی کے غیر مطبوعہ مجموعہ کلام ”مہر کار“ پر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا عکس تحریر

سالار مسعودی

قدیر شیدائی اور ”دیوتاؤں کی حکومت“

--- ایک تاثر ---

جناب قدیر شیدائی قدیم تواریخ اور اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی کتاب ”دیوتاؤں کی حکومت“ ان کے سلسلہ مطالعہ کی پہلی کڑی ہے جو بہت دل چسپ ہے۔ اگرچہ یہ کتاب تحقیق و تاریخ کے آئینے میں ہمارے سامنے دنیا کے قدیم کے دیومالائی تصورات، تاریخ و تہذیب اور ثقافتی احوال کو پیش کرتی ہے تاہم قریب تر تاریخی حقائق کو بھی ہمارے سامنے لاتی ہے جس سے قدیم و جدید کا ایک تقابلی پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں چینی، یونانی، ایرانی اور ہندوستانی تہذیبوں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ قدیم تہذیبیں اپنے اپنے عہد میں انتہائے کمال کو پہنچی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی قدیم سلطنتوں کا وجود ان کا مرہون منت تھا۔ ان ادوار میں ان گنت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی تھی۔ انسانی جانوں کی جھینٹ چڑھائی جاتی، انسانوں کو ایسے سخت اور اذیت ناک محنت اور مشقت کے کاموں پر مجبور کیا جاتا کہ ان کی ارواح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتیں۔ انسانیت کی ایسی تذلیل کی جاتی اور ایسی درگت بنائی جاتی کہ باید و شاید۔

قدیر شیدائی نے اس کتاب میں ماضی کے کھنڈروں میں مدفون چند قدیم تہذیبوں یعنی یونانیوں، رومیوں، کلدانیوں اور بابلیوں کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس میں ہر قدیم تہذیب کے تخلیق کردہ اپنے اپنے خیالی دیوی دیوتاؤں جو خدائی اوصاف، جاہ و جلال اور کثرت و فر سے اپنا نظام حکومت چلایا کرتے تھے۔ پورے کرہ ارض پر ان ”دیوتاؤں کی حکومت“ کا عمل دخل تھا۔ وہ طرح طرح کے مافوق الفطرت کارنامے انجام دیا کرتے تھے۔ انھوں نے تخلیق عالم کے سلسلے میں بڑے مجیر العقول اور طلسماتی کرتب دکھائے تھے۔ انھی وجوہات کی بنا پر اس کتاب کا نام ”دیوتاؤں کی حکومت“ رکھا گیا ہے۔

صاحب کتاب کے مطابق مصر، برطانیہ اور فرانس کے عجائب گھروں میں عراق، شام، بابل اور مصر کی سرزمینوں کے بے شمار نوادرات رکھے ہوئے ہیں جن میں دیوی دیوتاؤں کے مجسمے، مٹی کی تختیاں، بلند و بالا اہراموں کے نمونے اور حنوط شدہ میاں اپنی پوری روایت کے ساتھ موجود ہیں۔

اس شوخ کا وجود بھی آفت ہے اے فتیر

ڈھلنے لگا شباب تو فتنے جواں ہوئے

جو لوگ جلدی میں ہیں، پہلے ہی قدم پر تمام منزلیں طے کرنا چاہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زمانہ بھی تیز رفتار ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے گھوڑوں پر سفر طے کیا جاتا تھا۔ اب ہوائی جہاز پر کیا جاتا ہے۔ وہ مناظر جو سفر کے دوران دیکھے جاسکتے تھے، اب معدوم ہو چکے ہیں، لہذا شاعری سمٹ کر کسی جہاز کے اندرونی ماحول کی طرح ہو گئی ہے، جہاں کوشش کی جاتی ہے کہ آپ محسوس کریں کہ آپ سفر میں نہیں ہیں۔ منزل پر پہنچ کر رفتار میں کمی ضرور آ جاتی ہے مگر رویے تبدیل نہیں ہوتے۔

قدیر شیدائی کو جدید سفر پسند نہیں ہے۔ وہ بہت آہستہ روی کے ساتھ زندگی کی لذتوں اور مشکلوں میں سے گزرنا چاہتے ہیں۔ امرتسر سے تعلق کے باعث ان کے ہاں ایک بے قراری کا عنصر ضرور موجود ہے کہ چیزوں کو جاننے کی شدید خواہش ہے مگر وہ جلدی میں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی جدوجہد سے بھری ہوئی زندگی ایک سوئی سے گزاری ہے، بڑے بڑے ہاتھ مارنے کی کوشش نہیں کی، صبر اور قناعت کو اپنا معمول بنایا ہے اور اقتصادی ہماہمی کے باوجود شاعری کے معمولات میں فرق نہیں آیا۔ حوصلہ مندی کی ایک فضا انھوں نے ہمیشہ قائم رکھی ہے۔

شاعری کی یہ کتاب ان کی روداد بھی ہے اور آسودہ اور نا آسودہ لہجہ کا بیان بھی ہے۔ اس کی ورق گردانی سے آپ زندگی کے کئی رخ دیکھیں گے اور مجھے اعتماد ہے کہ آپ ان کی آواز میں آواز ملانے کی بھی کوشش کریں گے۔

۱۷ جولائی ۲۰۰۱ء

اگرچہ یہ قدیم تہذیبیں اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں، لیکن برصغیر میں ہندو جاتی اور جاپان میں جاپانی اب بھی ان گنت دیوتیوں کی پوجا پاٹ میں مصروف ہیں۔

کتاب میں اساطیری حوالوں سے دیومالائی عقائد اور ان سے متعلقہ دل چسپ روایات سے ہمیں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں، جو مصری دیوتا، یونانی دیوتا، ہندو آریا اور ان کے دیوتاؤں پر مشتمل ہیں۔ ان ممالک سے متعلق دیوتاؤں کی کارگزاریاں بڑے پر لطف اور دل پذیر پیرایے میں بیان کی گئی ہیں۔

اس کتاب میں زمانہ قدیم سے لے کر اب تک ہر دور میں پیدا ہونے والے مصلحین اور فلاسفوں، مثلاً کنفیوشس، جین مت کے مہاویر سوامی، بدھ مت کے گوتم بدھ، سوامی ہندوازم، برہمن پنٹھ اور ان سے متعلقہ وید پران اور مختلف شاستروں کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ اسلام کے سلسلے میں محمد بن قاسم، سلطان صلاح الدین ایوبی، محمود غزنوی، اورنگ زیب عالمگیر، احمد شاہ ابدالی کا شایان شان ذکر کیا گیا ہے۔ بھگتی تحریک کے بانی سوامی رامانند (۱۰۱۳ء تا ۱۱۳۷ء) اور پنجاب میں وحدت کا گیت گانے والے بابا گورونانک وغیرہ کا بخوبی تذکرہ ملتا ہے۔ ان کے علاوہ جنگ آزادی اور بہادر شاہ ظفر سے لے کر دوقومی نظریہ اور نظریہ پاکستان کے زعماء سید احمد خان، علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح پر بھرپور مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

قدیر شیدائی کا مقصد تالیف محض قدیم تاریخ و ثقافت کو بیان کرنا نہیں، بلکہ کتاب کے مطالعے سے یہ بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جب ہم قدیم تہذیبوں کے آئینے میں ترقی یافتہ اور بعد کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان نے عقل و شعور کی منزلیں کس طرح طے کیں اور زندگی اور خدا کے بارے میں اس کے معیارات کن اصولوں پر متبج ہوئے۔ اور پھر اس کتاب کے مطالعہ سے ہمارے پاکستانی نوجوان یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ قدیم تہذیبوں اور زمانہ حال کی جدید تہذیبوں کے مقابلے میں اسلامی تہذیب کے تعمیری اصول کس قدر اہم ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کا انتساب اسی مقصد کے تحت نئی پود کے نام کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے حوالے سے اہم تر بات یہ ہے کہ وحی الہی سے بے نیاز ہو کر جن تہذیبوں نے محض وہم و گمان پر اپنے عقائد و نظریات کی بنیاد رکھی، انہوں نے حقیقت شناسی کے معاملے میں کس قدر ٹھوکریں کھائیں اور انسان کو یہ حیثیت مجموعی کس طرح پہنچتیوں میں دھکیلا۔ اس لحاظ سے، قدیم و جدید کے تناظر میں، اسلامی عقائد اور اسلامی تہذیب سے بہرہ ور ہونے کے لیے جناب قدیر شیدائی کی اس کتاب کا مطالعہ خاص طور پر ہماری نئی نسل کے لیے انتہائی اہم ہے۔

نوید صادق

قدیر شیدائی کی غزل

اردو غزل کی ابتدا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زبان اردو کی ابتدا سے تاحال کتنے ہی ایسے نام پس پردہ چلے گئے جنہوں نے اس زبان کی ترویج و ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ وقت بہت ظالم ہے۔ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ پس منظر میں رہ جانے والوں میں ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے کلام کی اشاعت کی جانب دھیان ہی نہیں دیا، کلام کی جانب دھیان دینا تو ایک طرف ان میں سے بعض نام تو ایسے ہیں کہ انہوں نے زبان و ادب کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں مگر اپنی ذات اور اپنے گھر بار کو بھی زیادہ توجہ نہ دے سکے۔ ایسا ہی ایک نام قدیر شیدائی مرحوم کا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دورانِ تعلیم غالباً جماعت ہشتم میں تعلیمی نصاب میں شامل خوشی محمد ناظر کی ایک شہرہ آفاق نظم ”جوگی“ پڑھی۔ یہ نظم ایسی باکمال تھی کہ طویل ہونے کے باوجود اس کے کئی کئی بند ہمیں زبانی یاد تھے۔ لیکن ہمیں مطلق علم نہیں تھا کہ خوشی محمد ناظر کون ہیں۔ ان کے بارے میں اس نظم کے علاوہ کبھی کہیں کچھ نہ ملا۔ وقت گزرتا گیا۔ جامعہ ہندسیہ میں تعلیم کے دوران ایک دن انارکلی میں پرانی کتابوں کے ایک اسٹال پر خوشی محمد ناظر نمبر نظر آیا، فوراً خرید لیا۔ یہ ماہ نامہ فانوس تھا جس سے خوشی محمد ناظر کے بارے میں تفصیلی جاننے کا موقع ملا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ قدیر صاحب نے خوشی محمد ناظر کا مجموعہ کلام بھی شائع کر رکھا ہے۔ ”مقدمہ عبدالعزیز خالد نمبر“ قدیر شیدائی اور ماہ نامہ فانوس کا ایک اور زریں کار نامہ ہے۔ پھر ایک عرصہ بعد جناب خالد علیم سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک دن انہوں نے کہا: قدیر شیدائی صاحب بیمار ہیں، ان کی طرف چلتے ہیں۔ اس روز ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ بیماری کے باوجود طبیعت میں شگفتگی اور مہمان نوازی نمایاں تھی۔ پھر خالد صاحب کے ساتھ ہی ان سے دوسری اور آخری ملاقات ہوئی۔ خالد صاحب سے معلوم ہوا کہ قدیر شیدائی صاحب کا گھر کبھی معروف ادیبوں کے لیے ایک اجتماع گاہ کا درجہ رکھتا تھا۔ منیر نیازی، عبدالعزیز خالد، علیم ناصر، نور بجنوری،۔۔۔ اور دیگر بے شمار احباب اکثر ماہ نامہ فانوس کے دفتر میں پائے جاتے تھے۔ ان کا دروازہ اجنبی اور آشناؤں سب کے لیے ہمہ وقت کھلا رہتا، بلا کے مہمان نواز واقع ہوئے تھے۔ نوجوان ادیبوں شاعروں کے لیے ہمیشہ آغوش کشار ہتے تھے۔ یہ باتیں بظاہر غیر متعلق محسوس ہو رہی

ہوں گی لیکن مجھے یہ سب اس لیے لکھنا پڑا کہ آج اسی ماہ نامہ فانوس میں انھی قدیر شیدائی پر حنا ص اشاعت کے لیے لکھ رہا ہوں۔۔۔ وہ قدیر شیدائی جنھوں نے اپنی زندگی ادب کے نام کر دی لیکن اپنی تخلیقات کو کبھی قابلِ اعتناء نہ جانا۔ اللہ بھلا کرے جناب محمد شکور طفیل کا کہ قدیر صاحب پر فانوس کی خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہے ہیں بلکہ ان کے غیر مطلوبہ مجموعہ کلام ’مہکار‘ کو بھی اس اشاعتِ خاص کا حصہ بنا رہے ہیں۔

قدیر شیدائی کی شاعری کی بات کی جائے تو وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اور اسی میں ان کے جو ہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان کی غزل کا بنیادی موضوع عشق اور حسن و جمال کی کیفیات کا بیان ہے۔ اس حوالے سے بغور دیکھا جائے تو ان کی نظر ان کے محبوب سے ہٹتی ہی نہیں۔ وہ ابتداً ان شعرا کی جانب پیش قدمی کرتے دکھائی دیتے ہیں جو محبوب کو مرکزِ حسن کا نکتہ جان کر کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن قدیر شیدائی، جہاں تک میں ان کی شاعری کا مطالعہ کر سکا ہوں، محبوب کے حسن و جمال سے آگے نہیں بڑھے۔ ان کا آغاز اس نوعیت کے اشعار میں محبوب سے شروع ہو کر محبوب ہی پر ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن پتے کی بات یہ ہے کہ ان کے جذبے اور فکر میں ہم آہنگی ان کے شعر کو پُرکشش بنا دیتی ہے کہ یہ ان کا اپنا مشاہدہ اور اپنے احساسات کی عکاسی ہے، سنی سنائی کہانی سنانے کی کوئی صورت سامنے نہیں آتی۔ قدیر شیدائی کی جمالیاتی حس ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:

ہونٹوں پہ تبسم کا جادو کا جل سے آنکھ سجائی ہے اک مومن جیسے کافر نے تصویر نئی دکھائی ہے
وہ گورا گورا سا مکھڑا اک پھول دکھائی دیتا ہے ان نیلی نیلی آنکھوں کی جھیلوں میں بڑی گہرائی ہے
یہ جھیلیں، دریا، کوہ و دمن یہ شام و سحر کی رنگینی
سب تیری ادا کے مظہر ہیں، سب تیرے ہنر کی باتیں ہیں
ادا میں، شوخیوں، آنکھیلیاں، مستی سے پُر غمزے پڑھا اُس نے جوانی کا نصاب آہستہ آہستہ

رات نے تیرگی مانگی ہے تری زلفوں سے چاند نے تیسرے تبسم سے ضیا پائی ہے
ہائے اس شوخ کا اندازِ تکلم بھی متدیر بارہا جس کو بھلانے کی قسم کھائی ہے

رنگ ہے، روپ ہے، جوانی ہے چار سو دورِ شادمانی ہے

□

آنکھ میں ہت نیشہ جوانی کا رخ پہ شرم و حیا کی لالی تھی
اور کچھ بھی نہ ہت کمال اپنا تیری صورت غزل میں ڈھالی تھی

درج بالا اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محبوب کے حسن و سراپا کے بیان میں جو لذت، جود کشی پائی جاتی ہے بناوٹی یا خیالی نہیں، نہ ہی یہ جمالیاتی اسلوبِ مشاعرے لوٹنے کے لیے ترتیب دیا لگتا ہے۔ یہ سراسر شاعر کے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔ وہ آواز جس میں خوب صورت چہروں بلکہ کسی خاص چہرے (جس کی بابت اشارے آگے چل کر دیے جائیں گے) کو دیکھ کر جو احساسات و جذبات سراٹھاتے ہیں، یہ ان احساسات و جذبات کا خالص شاعرانہ بیان ہے، اور شاعر یہ اعلان بھی کر رہا ہے کہ اس کی غزل اس کے محبوب کے دل کش سراپا کی تصویر کشی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ نہیں کہ قدیر شیدائی کی غزل میں حسن و عشق سے ہٹ کر موضوعات نہیں پائے جاتے، لیکن معاملاتِ حسن و عشق ان کے بڑے موضوعات ٹھہرتے ہیں۔

محبوب کے حسن و سراپا کے بیان کے بعد سب سے بڑی چیز جو سامنے آتی ہے وہ کیفیاتِ انتظار کی تصویر کشی ہے۔ معاملاتِ عشق و محبت میں یہ موضوع ہمیشہ سے ایک اہمیت کا حامل رہا ہے۔ کہیں محبوب کے وعدے پر اس کا انتظار ہو رہا ہے، کہیں یہ خواہش کہ کب وہ بام پر آئے، اپنا جہلولہ دکھائے اور عاشق کی دل داری کرے۔ کہیں سہانا موسم، ارد گرد کا خوب صورت ماحول شاعر کے دل میں اس احساس کو ایک خواہش اور پھر حسرت کا درجہ دے دیتا ہے کہ ہائے کاش۔۔۔ وہ بھی ساتھ ہوتا، وہ ساتھ ہوتا تو۔۔۔ یہاں یہ امر بھی لائقِ توجہ ہے کہ ایسے عالم میں شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ محبوب کے انتظار میں صرف وہی اکیلا نہیں، بلکہ یہ پھول، چاند، ستارے، بادل سب اس کے منتظر ہیں۔ اس سے ملتا جلتا وہی ہماری کلاسیک شاعری میں بڑے بھرپور انداز میں اپنی جھلمکیاں دکھاتا ہے۔۔۔ کچھ بھی ہو، یہ انتظار کے لمحے عاشق کے لیے کسی پہاڑ سے کم نہیں ہوتے۔ وقت ٹھہرا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ بقول محشر بدایونی: ”کلام کرتے ہیں در، بولتی ہیں دیواریں“۔ قدیر شیدائی کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

کروٹ بدل بدل کے گزاری تمام رات خوشبوے انتظار میں جلتا رہا بدن

رُت مستانی، پھول کھلے ہیں، خوشبو ہے، تنہائی ہے بادل رستہ دیکھ رہا ہے، جانے تم کب آؤ گے

وہ بال بکھیرے چہرے پر مصروف ہیں حسن آرائی میں
ہم ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں بیتاب کھڑے انگنائی میں

اے جان! رسیلے ہونٹوں سے اک شام ہمیں بھی مل جائے
سائے میں تمھاری زلفوں کے پرکھیف مہکتی راتیں ہیں

اک ترے آنے کا امکان لیے آج ہم ساتواں درکھولتے ہیں
اور پھر جب انتظار کی یہ گھڑیاں ختم ہوتی ہیں تو بعض اوقات۔۔۔ اب اسے محض معاملہ بندی
کی ایک کوشش کہہ لیجیے کہ حقیقت کا دلوک بیان بغیر کوئی لگی لپیٹ رکھے، جھجک نام کو نہیں، لیکن یہ معاملہ
ابتدال تک نہیں پہنچنے دیا کہ غزل کی اقدار سے مکمل واقفیت رکھتے ہیں:

آج کی شام کیا سہانی ہے وہ ہیں اور اپنی میزبانی ہے

تنبہائی میں آہٹ سے، اس شوخ کا ڈر حبانا
گرنے کے بہانے سے تاریک سے زینے میں
اظہارِ محبت کا ہم نے یہ ہنر حبانا
لگ کر مرے سینے سے بیتاب سا کر حبانا

میں مستی میں جھوم گیا ہتا
آنکھوں میں تھے خواب سہانے
جس دم دروازہ کھٹکا ہتا
باتوں میں اک حباد و سا ہتا
اس سے آگے کچھ مت پوچھو
میں پیسا ہتا، وہ دریا ہتا
اس کے پیار کا ساون رت میں
بادل بھی کھل کر برسا ہتا

لیکن اس سب کے بعد وہی ازلی جدائی جو ہماری اردو غزل کے شاعر کا مقدر رہی ہے۔ ازلی
یوں کہا گیا کہ انسان کے خواب کبھی پورے نہیں ہو پاتے۔ سوچا کچھ ہوتا ہے اور ہو کچھ اور جاتا ہے۔
حقیقت اور خوابوں کا یہی تصادم شاعر کو بے چین رکھتا ہے۔ لوگ اسے اپنے اوپر ہنستے دکھائی دیتے
ہیں۔ ایسے میں یہ بھی یاد رہے کہ محرومی یا ناکامی کوئی اور بھی ہو تو غزل گو شاعر اسے کھینچتا ان کراہتی
محبت کی ناکامی کے زمرے میں لے آتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہر چند میرے ساتھ وہ کچھ دور تک گئے
پھر مسکرا کے بولے مرے پاؤں تھک گئے

□ وہ کسی اور کا مقتدر ہتا
آس ہم نے عنلط لگا لی تھی

محبت میں وہ رسوائی ہوئی ہے
کہ اک دنیا تماشا ثانی ہوئی ہے
تماشا ہے ترا مجھ سے بچھڑنا
کہ خلقت پوچھنے آئی ہوئی ہے

تاراج کر گیا وہ مرے دل کی سلطنت!
کیا کیا نہ ولولے تھے کہ بے خانماں ہوئے

لسٹ گئی بزم خیالوں کی، بڑی دیر ہوئی
کوئی جلوہ ہے نہ اب کوئی تماشا ثانی ہے

تیری دنیا سے مری دنیا تک
ہر آن پریشاں رکھتی ہے جلتی بھی نہیں، بجھتی بھی نہیں
اک پھول سے نازک چہرے نے کیسی یہ آگ لگائی ہے
ایسے میں یہ کہہ کر دل کو بہلانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ:
عمر بھر کون سا تھ دیتا ہے
مانیے، اعتبار کر لیجے

تری خوشی کے لیے جی رہے ہیں دیوانے
نگار حنائے ہستی میں آدمی کا وجود
وگرنہ لاکھ بہانے تھے خود کشی کے لیے
کہیں غموں کے لیے ہے، کہیں خوشی کے لیے
لیکن یہ سب معاملات، یہ سب باتیں انسانی ذہن میں یادوں کی صورت بس جاتے ہیں اور
وقفے وقفے سے کہیں یہ یادیں ماضی کے درپہلوں میں جھانکنے اور ان سے کوئی سبق سیکھنے کا باعث بنتی
ہیں تو کہیں محض دل کو بہلانے کا ایک بہانہ۔۔۔ یہ یادیں کہیں خوش گوار خوابوں کی صورت میں سامنے
آتی ہیں تو کہیں محض پچھتاوا بن جاتی ہیں۔ اس باب میں بھی قدیر شیدائی کے ہاں حسن و دل کشی، اس
سے جدائی کی خلش وغیرہ زیادہ نمایاں ہیں:

سال گزشتہ، سات نومبر، دن معلوم نہیں وہ کیا ہتا
ساتھ جنیں گے، ساتھ میں گے یاد کرو، یہ تم نے کہا ہتا

شعلہ سا بھڑکا ہے دل میں، اک بجبلی سی لہرائی ہے
برسات کی بھیگی راتوں میں جب یاد کسی کی آئی ہے
اس شوخ کی چاہت کا حاصل اب کچھ بھی نہیں ہے اس کے سوا
یا شعر و سخن کی باتیں ہیں یاد در بھری تہنائی ہے
ماضی کے سمندر میں پنہاں ہے ایک حسزیرہ خوابوں کا
اب میرے خیالوں کی رونق اس خواب نگر کی باتیں ہیں

نیند میں خواب عجب آتے ہیں آنکھ کھلتی ہے تو ڈر جاتے ہیں
قدیر شیدائی کے ہاں اقدار کی پامالی کا موضوع بھی جگہ جگہ ملتا ہے۔ کہیں انھیں یہ شکوہ ہے کہ
نئے لوگ پرانے لوگوں کو فراموش کرتے چلے جا رہے ہیں تو کہیں یہ رنج کہ پرانی اقدار، رشتوں کا
نقد، دوستی، راست گوئی، بے راہ رواقفلوں کے مانند آگے بڑھنے والے لوگ، عدل و انصاف کی
عدم فراہمی، مغائرت، فرد کا معاشرے اور قوم کی طرف عدم دل چسپی کا رجحان اور ایسے بہت سے
مسائل جو فرد سے اٹھ کر معاشرے کے راستے ہمارے قومی المیات کا روپ دھار چکے ہیں۔۔۔
قدیر شیدائی کہیں کہیں ناصحانہ تو کہیں ان سب معاملات میں طنزیہ پیرایہ، بیباں اختیار کرتے نظر آتے
ہیں۔ چند اشعار دیکھیے:

فطرت میں نہیں تسلیم و رضا اندازِ مخاطب کیا کہیے
رشتوں کا تقدس بھول گئی، یہ نسل بڑی ہر جہائی ہے

دشمن کی بے بسی بھی نہ دیکھی گئی فتیر
دل میں خیال آگیا روزِ حساب کا

مخدومیت کو دست نگر کر دیا گیا
ازبر نہ کر کے کوئی آئین دوستی
مسند نشیں کو حنا کب بسر کر دیا گیا
ہر ضابطے کو زیر و زبر کر دیا گیا

بھٹک رہے ہیں نئے لوگ روشنی کے لیے
کوئی پیامِ محبت! نئی صدی کے لیے

رہبر بھی عجب، قافلے والے بھی عجب ہیں
سننے ہو پرندوں کی غم ناک صدائیں؟
رستے کی خبر کوئی نہ منزل کا پتا ہے
سرسبز درختوں کو دھواں چاٹ رہا ہے

اس بزم میں کسی کو کسی کی خبر نہیں
دل جل رہے ہیں اور کوئی چہرہ گر نہیں
یہ کون سی منزل ہے کہ منصف نہیں ملت
مظلوم صدا دیتا ہے، انصاف کہیں ہے؟
مجھ کو خبر کے واسطے کوہ ندا دیا گیا
دیکھنا میرے عہد کے بچوں کو کیا دیا گیا

عظمت کی جستجو ہے تو خدمتِ شعار ہو ہے مال و زر عزیز تو موقع شناس بن
اپنے وطن، اپنی سرزمین سے محبت ان کی سرشت میں ہے۔ وہ اسے تمام جہان سے افضل
جانتے ہیں۔ وہ لوگ جو ہمیشہ دوسری اقوام کی جانب دلوں میں ایک نوعیت کا احساس کم تری لیے رہتے
ہیں، ان کے نزدیک قابلِ رحم ہیں:
کعبہ بھی یہیں ہے تو مدینہ بھی یہیں ہے کیا اپنی زمیں ہم سرفلاک نہیں ہے؟

ہلال اور ستارہ ہے عظمتوں کا نشان بہت حسین ہے جو پرچم مرے وطن کا ہے
مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ قدیر شیدائی ایک ایسے صاحب فن ہیں جنہوں نے
اپنی زندگی شعر و ادب کی خدمت میں بسر کر ڈالی۔ ان کی تخلیقات خاص طور پر غزل ان کے عشقیہ
احساسات کی ترجمان ہے۔ ان کا احساسِ جمال اس راستے میں ان کا راہ بر ہے۔ اقدار کی پامالی انھیں
کھلتی ہے تو اس کا برملا اظہار کرتے ملتے ہیں۔ ان کا پیرایہ بیباں سادہ، براہ راست اور لفظی ہیر پھیر
سے مبرا ہے۔ وہ نہ خود کسی الجھن کا شکار ہیں اور نہ ہی پیچیدگی سے قاری کو کسی الجھن کا شکار کرنا چاہتے
ہیں بلکہ اپنی عشقیہ واردات کے اظہار میں سلیقے سے بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ اس حوالے سے
میں اُن کا ایک شعر درج کر کے سلسلہ کلام کو ختم کرنا چاہوں گا:
رفتہ رفتہ آتے ہیں آدابِ محبت کرنے کے
بات سلیقے سے کہنے میں ایک زمانہ لگتا ہے

محمد شکور طفیل

قدیر شیدائی کی غزلوں کا اجمالی جائزہ

ہمارے ہاں کسی شاعر کے حقیقی ادبی قد کا ٹھہ کو جانچنے کا ایک سادہ طریقہ یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ اس کے کلام کو کسی بڑے شاعر کی شاعری سے تقابل کر کے دیکھا جائے کہ اس کی کیا ادبی حیثیت اور کیا شاعرانہ معیار ہے، حال آں کہ کسی بھی شاعر کو پرکھنے کا صرف ایک ہی رُخ ہے کہ اُس کے کلام کو اس کی شخصیت، حالات و واقعات اور اُس کے اپنے تخلیقی معیار کو سامنے رکھ کر جائزہ لیا جائے۔ لیکن اگر محض کسی بڑے مرتبے کی شاعری ہی کو شعری پیمانہ سمجھ لیا جائے تو پھر آج کل کے نانوے فی صد شعرا کے کلام کو نظر انداز کرنا پڑ جائے گا۔ لہذا یہ لازم نہیں کہ ہر شاعر غالب، اقبال یا فیض ہو کہ ہر شاعر کا اپنا معیار، اپنا رنگ اور اپنی منفرد داد ہو سکتی ہے۔

اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ قدیر شیدائی کا شمار بڑی صف کے شعرا میں ہرگز نہ تھا مگر ہم انھیں کم از کم ساغر صدیقی کے شعری مرتبے کا شاعر ضرور کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں شعرا میں کئی چیزیں مشترک ہیں۔ دونوں درویش صفت شاعر تھے اور زیادہ پڑھے لکھے بھی نہ تھے۔ ان دونوں میں سے ایک شاعر نے دنیا سے بے نیازی اور دوسرے نے بلند مرتبہ اہل ادب سے نہ صرف نیاز مندی کا ثبوت دیا بلکہ اپنے کردار و عمل کے ساتھ لائق اعتبار ادبی مجلہ کے ذریعے گراں قدر ادبی خدمات کا فریضہ بھی نبھایا۔ دونوں کی شاعری میں سادگی پر کاری یکساں دکھائی دیتی ہے۔ دونوں آج کے شعرا کی نسبت غیر ملکی مشاعروں اور سیر سپاٹوں سے محروم رہے اور تمام دنیوی لذتیں ان سے دُور رہیں۔ کاروباری حضرات کے بڑے بنگلے ہوں یا حکمرانوں کے بڑے محلات، دونوں جگہ وہ داخلے سے محروم رہے۔ ان کے نہ انٹرویو شائع ہوئے، نہ ان پر کسی محقق کی نگاہ پڑی۔ ساغر صدیقی بہ حیثیت شاعر عوامی حلقوں میں پھر بھی شہرت کے بام عروج تک پہنچے مگر قدیر شیدائی اپنی کم آمیز طبیعت کے باعث فانوس کی مجلس ادب تک محدود رہے۔

میرا خیال ہے کہ ان دونوں درویش صفت شعرا سے میسویوں افراد نے فیض حاصل کیا ہوگا مگر خود انھیں وہ آسودگی میسر نہ آسکی، جو ان کا ادبی استحقاق تھا۔ دونوں کی شاعری میں حسن و عشق کی پاکیزگی میں ملبوس خوب صورت شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ دونوں میں کوئی دنیوی لالچ دور دور تک نہ تھا مگر حب الوطنی اور انسان دوستی کا جذبہ دونوں میں بلند درجے پر تھا۔ ایک اور اہم اور

مشترک پہلو یہ ہے کہ ان دونوں شاعروں کے مرنے کے بعد ادبی دنیا نے تو کیا، ان کے مستری دوستوں نے بھی انھیں غیر اہم شاعر سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ تاہم ساغر صدیقی کے کلام کو ادبی حیثیت کے بجائے آج بھی کم از کم عوامی مقبولیت ضرور حاصل ہے۔

ہر باشعور شاعر کی طرح قدیر شیدائی کے کلام کی بھی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کی غزل میں ایک جانب ہمیں قومی شعور اور پھر عالمی سامراج کے خلاف صداے احتجاج بلند کرنے کا پہلو ملتا ہے تو دوسری جانب ایک راسخ العقیدہ مسلمان کا جذبہ محبت دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری کا نمایاں ترین پہلو حسن و عشق کے جذبات سے عبارت ہے لیکن صنف غزل کی مروجہ خوبیوں کے ساتھ مختلف موضوع فکر کی جو آزادیاں ہیں، ان سے قدیر شیدائی نے بھی بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ گو کہ موجودہ تجزیہ نگاری کی روش کے خلاف یہ طریق تجزیہ کچھ پرانا محسوس ہوگا تاہم میں یہاں ان کے شعری موضوعات کے مختلف پہلوؤں اور عنوانات کی تقسیم کے ساتھ اظہار خیال کرنا چاہوں گا۔

قدیر شیدائی کا جذبہ حب الوطنی اور قومی شعور

قدیر شیدائی کی غزلوں میں ان گنت موضوعات کے ساتھ ان کا جذبہ حب الوطنی بھی ایک الگ خصوصیت رکھتا ہے۔ دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ ایک محب الوطن پاکستانی کی حیثیت میں انھوں نے اپنی غزلوں میں اس موضوع کو بھی بطور خاص بیان کیا ہے۔ اپنے ملک سے انھیں بے حد پیارتھا اور ان کی غزلوں میں محبت کا جذبہ بھی ان مٹ دکھائی دیتا ہے۔ اپنے وطن کے ساتھ دلی وابستگی کے علاوہ انھیں اپنی قومی زبان اردو سے بھی بے حد لگاؤ تھا۔ البتہ موجودہ نظام تسلیم سے وہ بڑے متنفر تھے۔ ان کے خیال میں لارڈ میکالے کا قائم کردہ نظام تعلیم نوجوانوں کے لیے زہرِ قاتل تھا۔ بقول ان کے ملک میں راج ”فرنگی نصاب“ ہی ہماری نئی نسل کو خراب کرنے میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

ہلال اور ستارہ ہے عظمتوں کا نشان بہت حسین ہے جو پرچم مرے وطن کا ہے

غالب و حالی و اقبال و ابوالاعلیٰ اتزی استلیم کے سلطان زبانِ اردو
ادب و منطق و تحقیق و تخصص کے لیے تجھ میں کس شے کا ہے فقدانِ زبانِ اردو
اس کے لشکر میں ہیں الفاظ کئی لاکھ قدیر اصطلاحوں کی ہے سلطانِ زبانِ اردو

ہرگز گلہ نہیں ترے افکار سے مجھے سارا فتور ہے یہ مفرنگی نصاب کا

ہیں خوب شاعروں کی یہ جدت طرازیں جو عیب مستند بھتا، ہنسر کر دیا گیا
فطرت میں نہیں تسلیم و رضا، اندازِ مخاطب کیا کیسے
رشتوں کا تقدس بھول گئی یہ نسل بڑی ہر جانبی ہے
عالمی سامراج نے جس طرح مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں، کشمیر، فلسطین اور بوسنیا
اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ عراق اور افغانستان امریکی جارحیت اور سامراجی ظلم و ستم کی زد میں آئے
اور یہ ظلم و ستم ہر مسلمان کے لیے سوہانِ روح ہے۔ قدیر شیدائی بطور شاعر ایک حساس دل رکھتے ہیں
اور انھوں نے پوری شدت سے عالمی سامراج کے اس ستم ناک رویے کو محسوس کیا ہے۔ ان کی شاعری
میں کبھی کشمیر میں ہونے والے ظلم پر صدا اے احتجاج ملتی ہے، کہیں بوسنیا میں ہونے والے نسل کشی پر
وہ بے حد مضطرب نظر آتے ہیں اور کہیں فلسطین اور عراق و افغانستان پر حملہ ان کے سینے پر زخموں کے
نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ انسانیت اور پھر خصوصاً مسلمانوں پر عالمی یہودی سازش کی چہرہ دستیاں تمام
عالم اسلام کے لیے ایک بڑا المیہ ہے۔ قدیر شیدائی نے پوری درمندی کے ساتھ ان المیوں کو محسوس
کیا۔ یہ اشعار دیکھیے:

تو پوں کی گرج ہے، کہیں چینوں کی صدا ہے بوسنیا و کشمیر میں اک حشر ہوا ہے
الحاق سے کم کچھ ہمیں منظور نہیں ہے کشمیر کے ہر بیرو جو ان کی یہ صدا ہے

یہ پھول چہرے یہ کلیاں، یہ کاروانِ چمن ہیں انقلاب کی زد میں، کسے بچاؤں میں

قدیر اٹھی نہ کوئی ظلم کے خلاف آواز حسینؑ ابن علیؑ سے تو سب کو نسبت تھی

اٹھتی ہے العطش کی صدا دل سے اے قدیر پہرے میں ظالموں کے ہے دریا فرات کا

ہر دور میں پیرو ہیں حسینؑ ابن علیؑ کے ہر دور میں اک معرکہ کرب و بلا ہے

تاریکی شب چیر گیا کس کا یہ نوحہ کس بیٹی کی آواز ہے، گھر کس کا حبلہ ہے
اس درمندی کے جذبات کا خود انہیں یوں احساس ہے:

قدیر مضطرب شعروں میں تو نے
یہ کیسی آگ بھڑکائی ہوئی ہے



قناعت پسندی اور صدا اے احتجاج

قدیر شیدائی کی شرافتِ نفسی اور فقر و درویشی کا پہلو ان کے اشعار میں کئی جگہ جھلکتا محسوس ہوتا
ہے۔ دراصل وہ فطرثاً سادہ منش تھے۔ ان کے ہم عصر اور ہجرت سے پہلے کے ہم وطن ساغر صدیقی
اور قدیر شیدائی میں فرق صرف اتنا تھا کہ ساغر صدیقی شراب کے نشے میں دھت ہو کر غمز لیں لکھتے
تھے تو قدیر شیدائی میں غمز لیں نہیں تھے۔ ان کے اشعار میں غمز لیں نہیں تھیں۔ ساغر صدیقی بھی
دنیوی نعمتوں سے محروم رہے تو قدیر شیدائی بھی کوئی متمول آدمی نہ تھے بلکہ دیکھا جائے تو حالات کی
کشاکش میں عام ضروریات زندگی سے بھی محروم تھے مگر اپنی طبعی درویشی کے باعث انہیں اس محرومی
کی کبھی کوئی شکایت نہ تھی بلکہ حوصلہ مندی کے ساتھ قدرت کی تقسیم پر شاکر و رضا مند رہنے والے
انسان تھے۔ تاہم ایک حساس شاعر کی حیثیت میں وہ اپنے ارد گرد کے حالات پر گہری نگاہ رکھتے تھے
اور اس پر ان کی صدا اے احتجاج بھی بلند رہتی تھی۔ وہ اپنے اشعار میں جا بجا مہنگائی، انسانوں کی آپس
میں بے اعتنائی اور زندگی کے دیگر مسائل پر کھل کر احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے ان
کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

آواز گھٹ گئی ہے گھرانے کے بوجھ سے کیا کیا شکایتیں نہیں سرکار سے مجھے

رہ گیا ہے قدیر اپنا بھرم جیب ہی کٹ گئی جو حالی تھی

جو بس چلے کبھی بازار سے نہ گزروں قدیر کہ مفلسی میں کئی خواہشیں دباؤں میں

میں لکھ رہا تھا مہر و محبت کی داستاں میرے فتم کو واقف زر کر دیا گیا

یہ دور قیامت ہے شاید، دنیا سے سروت روٹھ گئی

انسان کی وقعت کچھ بھی نہیں، سب مال و زر کی باتیں ہیں

اگرچہ وہ ان حالات سے بظاہر سمجھوتا کیا ہے ہوئے تھے مگر ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں امید کا
پہلو بھی روشن ہے کہ یہ حالات یوں ہی نہیں رہیں گے، ایک نہ ایک روز قسمت کی شاخ پر خوش حالی کے
پھول ضرور کھلیں گے مگر اس کے لیے:

محنت سے پھول کھلتے ہیں قسمت کی شاخ پر ہمت خدا سے مانگ اگر مال و زر نہیں

حالات میں تبدیلی یوں ہی نہیں آتی۔ بے شک اس کے لیے انسانوں کو کئی کٹھن مراحل طے
کرنے پڑتے ہیں۔ عزم و عمل، کوشش پیہم اور مسلسل جدوجہد سے انسان سمندروں کا جگر چیر سکتا ہے

اور زیرِ سطح کئی پوشیدہ گہر ہائے آبِ دانتلاش کر کے لاسکتا ہے، تاہم دوسری جانب ایک اور پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ جب ظلم و ستم اور نا انصافی حد سے بڑھ جائے تو قدرت کو بھی انسانوں کی بے چارگی پر رحم آجاتا ہے، پھر وہ انقلاب پروان چڑھتا ہے جو انسانوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس پہلو سے قدرِ شیدائی اس انقلاب کی دھمک محسوس کرتے نظر آتے ہیں:

عجب بے چارگی پھیلی ہوئی ہے خلق کے اندر کہ زیرِ پرورش ہے، انقلاب آہستہ آہستہ

قدرِ شیدائی: ایک صاحبِ فقر شاعر

قدرِ شیدائی اگر چاہتے تو اپنی ہمتِ مردانہ سے دولت دنیا بھی سمیٹ سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی طبعی سلامتی کے ساتھ صرف خدمتِ ادب کو اپنا وظیفہ بنایا اور اس کے لیے اپنا تمام وقت صرف کر دیا۔ وہ دنیوی دولت سے دور رہنے والے ایک درویش صفت انسان تھے۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بقول شاعر انھیں: ”نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا“ تھی۔ ان کی شاعری سے ہمیں ان کے معمولات زندگی میں درویشی و استغنا اور شرافتِ نفسی کا جو ہر دیکھنے کو ملتا ہے، اور یوں انھوں نے اپنی پوری زندگی ایک چھوٹی سی گلیا میں مختلف شاعروں اور ادیبوں کا دربار سجا کر گزار دی۔ علامہ اقبال نے کہا تھا:

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈو فقر جس فقر کی اصل ہے ججاری

اور قدرِ شیدائی کے ہاں اس فقر ہی کا معجزہ ہے کہ:

جہاں نیست آئی، وہیں سو گئے فقیروں کا کیا ہے، کہیں سو گئے

آباد ہے جب تک یہ ترے شہر کی گلیاں ہم کوئی فقیرانہ صدا کرتے رہیں گے
سجدہ بھی ضروری ہے قدرِ اپنے خدا کا اشعار میں ہم حمد و ثنا کرتے رہیں گے

قدرِ شیدائی کا تصورِ حسن و عشق

اُن کا یہ تصور بڑی سادگی اور پاکیزگی کے لباس میں لپٹا ہوا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں کہیں بھی حسن و عشق کو بے حجاب نہیں کرتے اور نہ ہی اسے سر بازار رسوا کرتے ہیں۔ یہ تصور ان کے ہاں ہمارے دوسرے شعرا سے بالکل مختلف ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے حسن و عشق کے جذبات میں وہ دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی کو لازمی قرار دے رہے ہوں۔ بظاہر عشق کسی پابندی کا محتاج نہیں لیکن ان کے ہاں یہاں بھی اخلاقی قدروں کی پاس داری لازم ہے اور اس اعتبار سے جذبہ محبت بھی حدِ ادب کا تقاضا رکھتا ہے۔ کسی ستم ظریف نے کہا تھا:

□

محبت گرم گرم آنسو، محبت سرد سرد آہیں
الہی ساری دنیا کو یہی آزار ہو جائے
مگر وہ ساری دنیا کے لیے اس آزار کی دعا نہیں مانگتے۔ ان کے ہاں محبت اور آدابِ محبت میں ارتباط لازم ہے اور یہ ارتباط جذبہ محبت میں یوں ہی نہیں پیدا ہو جاتا:

رفتہ رفتہ آتے ہیں آدابِ محبت کرنے کے

بات سلیقے سے کہنے میں ایک زمانہ لگتا ہے

اور اس محبت اور حسن و عشق کے جذبات سے مملو یہ چند شعر بھی دیکھتے جائیں:

تنہائی میں آہٹ سے اُس شوخ کا ڈر جانا اظہارِ محبت کا ہم نے یہ ہنر جانا

گیا وہ دور کہ چرچا تھا سرد و دانا کا اب اہتمامِ نیش و جو دزن کا ہے

بڑے غرور سے تکتے ہیں آئینہ وہ متدیر عتاب ڈھلتی ہے جوانی پہ حسن ظن کا ہے

آزاد نظم کے پیش رو تصدق حسین خالد کے بارے میں کہیں میں نے پڑھا تھا کہ تمام عمر انھوں نے کسی خیالی محبوب، اور اگر حقیقی بھی ہو، تو اُس کے بجائے اپنی شاعری کا مرکز و محور اپنی بیوی کو رکھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ قدرِ شیدائی کو اپنی بیوی کے علاوہ کسی خیالی یا حقیقی وجود سے کوئی ناتا تھا لیکن اُن کے کلام کی اندرونی شہادت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کا مرکز و محور بھی ان کی محبت کرنے والی بیوی کے علاوہ کوئی اور نہ تھا۔ انھوں نے اپنی ایک غزل میں تو کھل کر اپنی بیوی سے اظہارِ محبت کیا ہے۔ مثلاً یہ دو شعر دیکھیے:

جانے تیری مست نظر نے مجھ پر کیا حب دو پھونکا تھا

ہوش اڑے جاتے تھے میرے، مجھ سے پھر سنبھلا نہ گیا تھا

سال گزشتہ، سات نومبر، دن معلوم نہیں وہ کیا تھا

ساتھ جنیں گے، ساتھ تھ میریں گے، یاد کرو، یہ تم نے کہا تھا

یہ آخر الذکر شعر تو شاید بیوی سے شادی کی سال گرہ کے حوالے سے ہو سکتا ہے یا کسی خاص واقعے کی جانب اشارہ، البتہ جب یہ محبت کرنے والی وفادار بیوی دنیا سے رخصت ہوگئی تو انھوں نے ایک اور غزل خاص طور پر ”شاہین کوثر مرحومہ“ کے عنوان سے لکھی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

دیوانہ وار آئی تھی میرے جہان میں حسن و جمال اپنا دکھا کر چلی گئی

کچھ روز میرے ساتھ تھ ہماروں کی رُت رہی نقش و نگار اپنے بٹھا کر چلی گئی

جس کی ہنسی سے وجود میں آتی تھی کائنات نغمے وہ زندگی کے سنا کر چلی گئی

ایسے بھی چھوڑتا ہے کوئی غم گسار سا تھ؟ میں ہنس رہا تھا، مجھ کو رُلا کر چسلی گئی
 قدیر شیدائی کے کلام میں برسات کی علامت
 قدیر شیدائی کی غزلوں کا جائزہ لینے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ برسات کا موسم
 انھیں بے حد مرغوب ہے۔ ایسے لگتا ہے کہ بارش سے ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔
 بارش، برسات اور بادلوں کا تذکرہ ان کی شاعری میں جگہ جگہ بکھرا پڑا ہے۔ اس حوالے سے چند
 اشعار درج کرتا ہوں:

بے چین سے لگتے ہیں منظر مجھ کو گزری برساتوں کے
 کمرے میں لگی تصویر تری ہر آن مجھے تڑپاتی ہے
 ابر کرم نے پچھلے برس کر دیا نہال پھر اس کے بعد شاخِ تمنا ہری ہوئی

برسات کے موسم میں، یوں آئی ہے یاد اس کی
 جیسے گلِ تازہ کی خوشبو کا بکھر جاننا
 پیاسی رہی زمین محبت کی اے قدیر بادل اُمڈ کے آئے تھے لیکن گزر گئے

دیکھتے ہی دیکھتے سب داغِ عصیاں دھل گئے
 ڈشمن ہے محبت کی دنیا، اس رستے میں سو گھساتیں ہیں
 تڑپاتی ہیں تنہائی میں، برسات کی ایسی راتیں ہیں
 اک خوابِ حسین دیکھا تھا کبھی تعبیر بتائیں کیا اس کی
 کچھ زخم کھلے ہیں سینے میں، کچھ اشکوں کی برساتیں ہیں
 شعلہ سا بھڑکا ہے دل میں، اک بجلی سی لہرائی ہے
 برسات کی بیگی راتوں میں جب یاد کسی کی آئی ہے

قدیر شیدائی کی انسان دوستی

بنیادی طور پر قدیر شیدائی سادہ اور مستقل مزاج انسان تھے۔ غریب پروری اور انسان دوستی کی
 خصوصیات ان کی گھٹی میں پڑی تھیں۔ ان کی جیب میں بے شک دھیلا نہ ہوتا ہو، مگر مہمان نوازی میں
 ہمیشہ وہ دوسروں سے آگے آگے رہتے تھے۔ ان کے اشعار سے، جب کہ ان کی غزل میں اپنی بیوی
 سے محبت کا جذبہ ایک فطری امر کے تحت تھا، اور پھر اُس کی جدائی کے غم کو بھی کھل کر بیان کیا ہے،

صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تنہائی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ اسی طرح وہ اپنے ملنے جلنے
 والے افراد سے بھی ایک خاص دلی لگاؤ رکھتے تھے اور سماجی سطح پر ان کا شعور انتہائی بلندی پر تھا۔ اس
 میں ان کی انسان دوستی کا جذبہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اس حوالے سے چند مثالیں دیکھیے:
 دکھ درد بانٹ، خدمتِ انساں شعرا کر اس کے سوا نہیں کوئی مقصد حیات کا

دشمن کی بے بسی بھی نہ دیکھی گئی قدیر دل میں خیال آگیا روزِ حساب کا
 اور جہاں انسان دوستی کے بجائے خود غرضی اور حرص و ہوس کی کار فرمائی دیکھتے ہیں تو اُن کا
 دل درمنداں پر کڑھنے لگتا ہے:

از بر نہ کر سکے کوئی آئین دوستی ہر ضابطے کو زیر و زبر کر دیا گیا

سننے ہو پرندوں کی یہ غم ناک صدائیں؟ سرسبز درختوں کو دھواں چاٹ رہا ہے
 دیکھا جائے تو قدیر شیدائی نے مال و زر کے بجائے خدمتِ شاعری کی اہمیت ہی اپنے پیش نظر
 رکھی۔ موقع شناسی کو انھوں نے بھی اپنا شعار نہیں بنایا بلکہ وہ اس کم تر ”صفت“ کو اپنانے کے ہنر سے آشنا
 ہی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کس خوب صورتی سے طنز یہ پیرایے میں اس کا اظہار کرتے ہیں:
 عظمت کی جستجو ہے تو خدمتِ شعرا ہو ہے مال و زر عزیز تو موقع شناس بن

قدیر شیدائی اور یادِ ماضی

قدیر شیدائی کی شاعری کا حجم اگر کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے بہت سے اشعار کی پیش کش
 سے، جن میں سادگی و پرکاری کا عنصر نمایاں محسوس ہوتا ہے، یوں کہ جیسے وہ رات کی تنہائی میں اپنی دن بھر
 کی مصروفیات کی ڈائری لکھ رہے ہوں۔ دیکھا جائے تو شاعر کی زندگی کا ہر ورق اس کے احوال و کوائف کا
 ترجمان ہوتا ہے۔ اس کی ذاتی اور سماجی زندگی، مختلف تجربات و مشاہدات اور روزِ مزہ خیالات کی ایک جیتی
 جاگتی تصویر کی صورت۔ ان کی شاعری کا جائزہ لینے سے یہ بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ جیسے وہ
 اپنے خیالات و احوال کو شاعری کا روپ دے رہے ہوں۔ یہ چند مثالیں دیکھیے:

بیٹے ہوئے لحوں کی یادیں بیتاب و پریشاں رکھتی ہیں
 ہونٹوں پہ مرے نغموں کی جگہ اب آہوں کی سوغاتیں ہیں
 وہ جا بھی چکے مدتِ گزری، اب کوئی نہیں، جو آئے گا
 ماضی کے جھروکے میں بیٹھو اور شعر کہو تنہائی میں

تنہائی کے لمحوں میں، سوچا ہے قدیر اکثر
کس سمت چلے آئے، ہم نے تھا کدھر جانا
بیٹے دنوں کی یاد میں کب تک رہیں اسیر
کچھ اپنی شخصیت متنازع تھی شہر میں
اپنے عزیز بھی مجھے کمزور حبان کر
جو تہمتیں تھیں ان پہ، مرے نام کر گئے
ہر ایک شخص یہاں مست اپنی دھن میں ہے
قدیر شیدائی کی طویل اور مختصر بحر کی غزلیں

قدیر شیدائی نے بنیادی طور پر غزل ہی کو اپنے اظہارِ مدعا کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کی غزلوں میں لمبی اور چھوٹی دونوں طرح کی بحروں میں غزلیں مل جاتی ہیں۔ غزل طویل بحر میں ہو یا مختصر بحر میں، قدیر شیدائی کے بیان میں سادگی اور پرکاری اور شائستگی و شستگی یکساں دکھائی دیتی ہے۔ لمبی بحر میں ہندی بحر میں انہیں زیادہ پسند ہیں اور اس کی بنیادی وجہ ان کی طبیعت کی روانی اور نغمگی ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:

کل ہم نے قدرِ مضطر کو دیکھا تھا وفا کے رستے میں
وہ اب بھی تراد یوانہ ہے، وہ اب بھی تراشیدائی ہے

اب تیرے شہر کی گلیوں میں دکھ سہتا ہے، چپ رہتا ہے
تیرا یہ تیر شیدائی اس دور کا جو ن کار بھی ہے
انصاف کے پردے میں اب تک سر کٹتے ہیں مظلوموں کے
محفل میں تری انسان ابھی محکوم بھی ہے، لا حیا رہی ہے

لمبی بحر کی چند مثالوں کے بعد اب قدیر شیدائی کی چھوٹی بحر میں لکھی ہوئی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ چھوٹی بحر میں شعر کہنا بظاہر آسان، مگر اس وقت تک ہرگز آسان نہیں جب تک شاعر کلام پر پوری گرفت نہ رکھتا ہو۔ چھوٹی بحر کے لیے اساتذہ سخن نے ایک خاص معیار مقرر کیا ہے کہ بات اس انداز میں کی جائے کہ پورا بیان کھل کر سامنے آجائے اور نامکمل نہ ہو۔ دوسری اہم بات یہ کہ یہ سہل ممتنع کی خوبی سے مرصع ہو، یعنی: ”میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے“۔ اس حوالے سے قدیر شیدائی ہمیں ایک کامیاب اور معجز نگار شاعر نظر آتے ہیں:

مثل سقراط لگ رہا ہتا وہ ہاتھ میں چپائے کی پیالی تھی

مقبرے جن کے ہیں ویرانوں میں رونقِ بزمِ جہاں تھے پہلے

□

تیری دنیا سے مری دنیا تک
اب مرے سامنے آ بیٹھے ہیں
فناصلے اتنے کہاں تھے پہلے
وہ جو پردے میں نہاں تھے پہلے

نیند میں خواب عجب آتے ہیں
چاندنی رات سے خوف آتا ہے
آنکھ کھلتی ہے تو ڈر حباتے ہیں
قافلے اس میں بھی لٹ جاتے ہیں

قدیر شیدائی کے کلام میں سہل ممتنع ایک بنیادی خوبی ہے اور اس طرح کے اشعار بھی سہل ممتنع ہی کی ذیل میں آتے ہیں:

جا کر چمن میں دیکھیے اسلوبِ زندگی
کانٹے بھی ساتھ رکھتا ہے پودا گلاب کا

ملنے نہ آگئے ہوں کہیں آج وہ تدریر
کمرے میں ہے رچی ہوئی خوشبو گلاب کی

جیسے کسی چٹان سے چشمہ ابل پڑے
قدیر شیدائی نے اگرچہ بہت کم لکھا، اور جو کچھ لکھا، وہ ان کی شخصیت اور خیالات کی گہرائی کھولنے کے لیے کافی ہے۔ ان کی غزلوں کے تفصیلی جائزے سے ان کی شخصیت کا بھرپور خاکہ مرتب کیا جاسکتا ہے لیکن میں نے یہاں اجمالی جائزے ہی پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ میں بطور خاص اس بات کو دہرانا چاہوں گا کہ ان کی غزلیں ان کی ذاتی ڈائری کے بکھرے ہوئے اوراق ہیں جو ان کے خیالات اور عادات و اطوار کے روشن عکس ہیں۔ ان کی سادہ اور درویشانہ زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی سادگی، روانی اور ان کے جذبات کی حقیقی ترجمانی لیے ہوئے ہے۔ میں نے ان کی شاعرانہ کیفیتوں سے محسوس کیا ہے کہ وہ جس حال میں بھی رہے، عاجزی و درویشی ان کا طرہ امتیاز رہا۔ اپنی ایک اکلوتی حمد میں لکھتے ہیں:

بدل گیا ہے مزاجِ دوراں، کرم کی ٹھنڈی ہوا چسلی ہے
مری فغاں لب پہ آتے آتے صدائے تکبیر بن گئی ہے
اور یہ صدائے تکبیر قدیر شیدائی کی صدائے زندگی رہی ہے۔

مجھے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ میری تخلیق سب سے پہلے ماہ نامہ ”فانوس“ میں شائع ہوئی۔
 قدیر شیدائی نے ”فانوس“ کا دفتر گھر ہی پر قائم کر رکھا تھا۔ سارا دن مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ
 جاری رہتا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی مہمان چائے کے بغیر چلا جائے۔ وہ اگر چہ گہرے گندی رنگ
 کے تھے لیکن ان کا باطن آئینے کی طرح شفاف تھا۔ وہ علم و ادب کے واقعی شیدائی تھے اور نامساعد
 حالات میں بھی ”فانوس“ جاری رکھے ہوئے تھے۔ میں جب بھی ان سے ملنے جاتا تو یہی کہا کرتے،
 اتنی دیر بعد آئے ہو، کہاں چلے گئے تھے۔ حال آں کہ میرا ان کے ہاں اکثر آنا جانا رہتا تھا۔
 انھوں نے ”فانوس“ کو خون جگر دے کر پالا پوسا تھا۔ فانوس کے متعدد نمبر نکالے جن میں
 ”مقدمہ عبدالعزیز خالد نمبر“ بھی شامل تھا۔ وہ پرچے کو خوب سے خوب تر بنانے میں کوشاں رہتے
 اور ان کا ساٹھ سال قبل لگایا ہوا پودا ایک چھتینار کا منظر پیش کر رہا ہے جس کی آب یاری محمد شکور طفیل کر
 رہے ہیں اور خالد علیم ایسے کہنہ مشق شاعر اسے خوب سے خوب تر بنانے میں اپنی تمام تر
 صلاحیتیں بروئے کار لارہے ہیں۔

یادنامہ قدیر شیدائی

یعقوب پرواز

قدیر شیدائی: کچھ یادیں

ماہ نامہ ”فانوس“ کے بانی اور معروف شاعر قدیر شیدائی سے میری شناسائی اس دور میں ہوئی جب
 میں روزگار کے سلسلے میں اپنے گاؤں سے لاہور آیا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے قدیر شیدائی سے میری
 پہلی ملاقات ۱۹۷۶ء میں ہوئی۔ ان دنوں ان کے ادبی رفقا میں ممتاز نعت گو شاعر علیم ناصر اور ان کے
 فرزند خالد علیم شامل تھے۔

قدیر شیدائی ان لوگوں سے مختلف تھے جو بقول شاعر ”اور گھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں“
 بلکہ ان سے ملنے والا ہر شخص پہلی ملاقات ہی میں ان سے گھل مل جاتا۔ ان میں خلوص اور اپنائیت کوٹ
 کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا ظاہر اور باطن ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے۔ وہ
 جتنے اچھے شاعر تھے اس سے کہیں بڑھ کر وہ خوب صورت انسان تھے۔ خوش طبعی، بذلہ سنجی اور سادگی کی
 مجسم تصویر۔ میں نے ان دنوں ایک غزل فانوس کے لیے پیش کی تو مسکراتے ہوئے کہا۔ لگتا ہے ابھی
 کوچہ سخن میں نو وارد ہو۔ میں نے جھجکتے ہوئے کہا، آپ نے درست کہا لیکن مجھے آپ کی رہ نمائی اور
 حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ کہنے لگے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہر شاعر ابتدا میں زبان و بیان کی
 ایسی غلطیاں کیا کرتا ہے لیکن تمہارے مضامین غزل سے لگ رہا ہے کہ تم میں شاعری کے حسرا شیم
 موجود ہیں اور وہ دن دور نہیں جب تم شاعری میں نام پیدا کرو گے۔ قدیر شیدائی کے یہ الفاظ میرے
 لیے بے پناہ حوصلہ کا سبب ٹھہرے۔ چند روز بعد میں نے فکر اقبال کے حوالے سے ایک نظم بہ عنوان
 ”خودی“ کہی اور قدیر شیدائی کے ہاں لے دوڑا کہ اسے ”فانوس“ میں شائع کر دیا جائے۔ نظم دیکھتے
 ہی حسب عادت مسکرائے اور شاباش دیتے ہوئے کہا، خاطر جمع رکھو، نظم ”فانوس“ میں ضرور چھپے گی۔
 میں سمجھتا ہوں اگر وہ اس وقت میری حوصلہ افزائی نہ کرتے تو میرا ارتقائی سفر وہیں رک جاتا۔ ایسی
 صفات سے ہر کوئی متصف نہیں ہوتا۔ دیکھا گیا ہے کہ ادبی رسائل کے ایڈیٹروں کو آموزشعر کی حوصلہ
 افزائی کم ہی کیا کرتے ہیں لیکن قدیر شیدائی ایسے ایڈیٹروں سے قطعاً مختلف تھے۔

سید حامد یزدانی

---- یادوں کی دھنک رہ جاتی ہے

آج سے چالیس سال پہلے کی بات ہوگی۔۔۔ چالیس سال یا شاید اس سے بھی زیادہ۔۔۔! مضمون کے پہلے جملے ہی نے گو یا میرے وجود کو عشروں پار لاکھڑا کیا ہے۔ مزنگ لاہور کے ایک پرانے سے مکان کے صحن میں جس کی سرخ اینٹوں سے ملحق ایک مختصر سی کیماری میں جانے کب سے ایک پیپٹے کا اور ایک امرود کا پیڑ باہم خاموشی سے ہم کلام تھے اور صحن اور برآمدے کی حدود کا تعین کرتی ایک موٹی دیوار پر سے گل کاغذی کی بیللیں دوسری منزل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ننھی ننھی نازک سہ برگ سی کلیاں دھیرے دھیرے برآمدے اور صحن کے کونے میں گرتی رہتی تھیں۔ دوسرے کونے میں امی جان نے اپنا چولہا بنا رکھا تھا۔

”چھوڑ کیوں نہیں دیتے آپ طفیل ہوشیار پوری صاحب کے رسالے محفل کے دفتر حبانہ“۔ والد صاحب کو دتی بیگ تھامے دروازے کی طرف جاتے دیکھ کر امی جان نے کہا تھا۔ ”کوئی پیسے ویسے بھی نہیں دیتے وہ“۔

والد صاحب ایک لمحے کو رُکے اور بولے: ”کیسے چھوڑ دوں، چالیس سال کی دوستی ہے، چالیس سال کی“۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے مگر میرا منڈل سکول سطح کا ذہن اس حساب کتاب میں جُت گیا کہ چالیس برس کی عمر کو پہنچنے میں ابھی کتنا عرصہ لگے گا اور پھر اتنی عمر کی دوستی۔۔۔! کمال ہے!

اور آج میں یہی بات لکھ رہا ہوں تو ایک عجیب سا احساس ذہن ددل لگھیرے ہوئے ہے اور وقت گویا کسی تیز رفتار موٹر سائیکل پر سواری لاہور کی سڑکوں پر اڑا جا رہا ہے۔۔۔ اُس روز سنوڈنٹس اون چوائس (ریسٹوران) سے نکل کر خالد علیم صاحب کی موٹر سائیکل کب نسبت روڈ سے ہوتی ہوئی چوک گولمنڈی عبور کر کے بائیں جانب مڑتی ذیلی سڑک سے ہو کر ایک تین منزلہ مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ موٹر سائیکل کو سٹینڈ پر لگاتے ہوئے بولے: ”آئیں، اندر چلتے ہیں“۔ گرمیوں کے دن تھے اور کشادہ گلی میں وفا شعار بھائیوں کی طرح کندھے سے کندھا جوڑے کھڑے سبھی گھر ڈھوپ جھیل کر تھک گئے تھے۔ بس اونگھ سے رہے تھے۔ ہم دروازے پر جھولتا پردہ ہٹا کر سلام کرتے ہوئے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوئے تو نیم تاریکی میں ”ولیکم السلام“ کہنے والی ایک محترم آواز تو میں فوراً ہی پہچان گیا۔ یہ جناب علیم ناصر صاحب کی آواز تھی، اور گھر کی پہلی منزل پر

واقع یہ بیٹھک دراصل ادبی جریدے ”فانوس“ کا دفتر تھا جس کے ایک صوفے پر جریدے کے مالک و مدیر اعلیٰ قدیر شیدائی صاحب بیٹھے بلکہ دھسنے ہوئے تھے۔ علیم ناصر صاحب سے شرفِ ملاقات تو والد صاحب جناب یزدانی جالندھری کے ساتھ مجلس سیرت کے ماہانہ نعتیہ مشاعروں میں اور پھر خالد صاحب کے گھر اور دفتر میں بھی حاصل ہو چکا تھا مگر قدیر شیدائی صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ قدیر صاحب اور خالد صاحب کے درمیان عمر کے تفاوت کے باوجود ایک بے تکلف مگر پر وقار دوستی کا رشتہ بھی مہکتا ہے۔ قدیر صاحب قدرے تیز تیز بولتے تھے اور اس تیزی کے باعث کبھی کبھی ان کے جملوں کے کچھ الفاظ ایک دوسرے سے ٹکرا بھی جاتے اور ایک فوری ”صوتی تکرار“ کی دل چسپ سی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ مگر وہ اس کی پروا کیے بغیر اپنا مدعا بیان کرتے رہتے۔ اگر میری یادداشت ٹھیک ساتھ دے رہی ہے تو اس روز وہاں انعام الحق جاوید بھی تشریف رکھتے تھے جن کی تحریر ادبی گماشتے کے نام سے ان دنوں فانوس میں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھی اور خالد علیم صاحب علیم ناصر صاحب کے ساتھ اس جریدے کی مجلسِ ادارت میں شامل تھے۔

خیر، کچھ دیر بعد چائے آگئی۔ چائے پی اور کچھ بات چیت کے بعد ہم وہاں سے باہر نکل آئے۔

قدیر شیدائی کی شخصیت کے کمالات آہستہ آہستہ مجھ پر کھلنے لگے تھے۔ کچھ گاہے گاہے ملاقاتوں کے ذریعے اور زیادہ خالد علیم صاحب کی زبانی۔ کمال ہستی تھے وہ۔ مجھے سمجھ میں آنے لگا کہ گولمنڈی کی وجہ شہرت عام لاہوریوں کے لیے ”زحمت کام ودہن“ تک محدود رہی ہوگی مگر لکھنے والوں کے لیے اس علاقے کی اہمیت قدیر شیدائی کے ادبی محبتے ”فانوس“ کا دفتر تھا جہاں ہر دور میں نام و رادبی شخصیات کا آنا جانا رہا بلکہ بعض کا تو یہ ٹھکانہ بھی رہا۔

اس بات میں شک نہیں کہ ”فانوس“ کے شمارے بہت معیاری ہوتے تھے۔ اور پھر اس کے خصوصی شمارے۔ کیا کہنے! ان دنوں ادبی دنیا میں فانوس کے عبدالعزیز خالد نمبر کا چرچا تھا۔ ظاہر ہے کہ جریدے کا معیار اس کے مدیران کے اعلیٰ ذوق کا ترجمان اور ثبوت تھا۔ علیم صاحب شاعری اور ادارت کے جن معیارات کے پاس دار تھے ان کی مثال ملنا مشکل ہے اور قدیر صاحب کی نثر اور نظم میں مہارت کے جوہران کے احباب سے ڈھکے چھپے نہ تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا صحیح علم بہت بعد میں ہوا۔ دراصل ان کے اندر کا تخلیق کار ان کے مزاج کی سیمانی، مہمان نوازی اور دوست داری کے پردوں کے پیچھے چھپا رہتا تھا۔

وہ ملنے کے لیے آنے والوں کی آؤ بھگت میں لگ جاتے اور ان کے کارناموں کو اتنا سراہتے کہ میزبان مداح کی اپنی اہمیت دب کر رہ جاتی مگر انھیں اس کی چنداں پروا نہ تھی۔ مہمان کو دیکھتے چائے

اور دیگر لوازمات کے انتظام میں جُت جاتے۔ چائے کبھی کبھی سیڑھیوں کے راستے اور کبھی کبھی ایک ٹوکری میں دھری دروازے پر سامنے جھول رہی ہوتی۔ چائے اُٹھانے نہ خود جاتے تھے اور نہ مہمان کو جانے دیتے تھے۔ گلی میں سے گزرتے کسی لڑکے کے بالے کو اس کے پیار کے نام سے آواز دیتے: ”اُوئے لوفر، کدھر جا رہا ہے، پہلا ٹوکری چوں چاواں تھ اندر پھڑا دے“۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ یہ سارے کا سارا محلہ ان کا قریبی رشتہ دار ہے۔ جس بے تکلفی سے وہ ان سے بات کرتے تھے، جس اعتماد سے وہ انھیں ذمہ داریاں سونپتے تھے اور جس محبت سے وہ ان کے کام کرتے تھے، کبھی کسی نوجوان بے روزگار کی ملازمت کے لیے سفارش ڈھونڈ رہے ہیں، کبھی کسی کے لیے ڈرائیونگ لائسنس بنوانے میں مصروف ہیں اور کبھی کسی طالب علم کو امتحان میں کامیاب کروانے کے لیے وسیلوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ ایسے میں وہ مجھے شاعر، ادیب اور مدیر سے زیادہ ایک پُر خلوص سماجی کارکن محسوس ہوتے۔ انھیں جاننے والے میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ قدیر صاحب جہاں بزرگوں کا احترام کرتے تھے وہاں نوجوان لکھاریوں کی بھی بے پناہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔

نئے لکھنے والوں کی تحریریں بھی تو اتر سے ”فانوس“ میں شامل کی جاتی تھیں۔ ۸۸-۱۹۸۷ء میں جب میں کالج میں لیکچرار شپ کے ساتھ ساتھ حلقہ ارباب ذوق کی انتظامیہ میں بھی شامل تھا اور ریڈیو پاکستان لاہور کے علمی و ادبی پروگراموں کی ترتیب و تشکیل پر بھی مامور تھا، قدیر صاحب نے خالد علیم صاحب کی مصروفیات کے باعث مجھے ”فانوس“ کی ادارت کا اعزاز بخشا۔ اس ادارتی مرحلے کو جہاں قدیر صاحب کے اخلاص نے آسان بنایا وہاں میرے دوستوں ضیاء الحسن، امجد طفیل، اصغر عابد، اعجاز رضوی اور ارشاد بھائی (ارشاد حسین) کے تعاون نے بھی میری اعانت کی۔ جب ہم دوست پہلے دن بلکہ شام کو ان کے ہاں پہنچے تو وہ گویا اپنی یادوں کے مختلف ادوار میں کھو گئے۔ دوستوں کی باتیں کرنے لگے۔ ہماری فرمائش پر ایک خوب صورت غزل بھی سنائی جس کا مقطع وہاں موجود نوجوانوں کو بہت پُر لطف لگا:

اس شوخ کا وجود بھی آفت ہے اے قدیر

ڈھلنے لگا شباب تو فتنے جواں ہوئے

افسوس کہ اس عرصہ میں غالباً چند شمارے ہی ترتیب دیے جاسکے کیوں کہ پہلے مسیری دیگر مصروفیات اور پھر بیرون ملک سفر نے یہ رابطہ منقطع کر دیا۔ مگر اس مختصر صحبت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اس دوران میں مجھے قدیر صاحب کو قدرے قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ وہ ایک پرست کے، سیدھے سادے، بے تکلف اور شفاف انسان تھے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چند ماہ مجھے اور میرے

دوستوں کو قدیر شیدائی صاحب کے ساتھ مل کر ”فانوس“ شائع کرنے کو ملے، وہ یادگار رہے۔ اس دوران میں قدیر صاحب کی شخصیت کے کئی اہم پہلو ہم پر روشن ہوئے جن میں سب سے نمایاں ان کا اخلاص تھا، اور پھر مہمان نوازی، ان کا گفتگو کا بے تکلفانہ انداز اور ماضی کے ادبی قصے۔ ایک روز کہنے لگے یہ جس جگہ آج تم لوگ بیٹھے ہو یہیں ایک دور میں شہزاد احمد اور منیر نیازی بیٹھا کرتے تھے اور یہ کہ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ بعد ازاں خالد احمد صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک زمانے میں وہ بھی باقاعدگی سے ”فانوس“ کے دفتر جایا کرتے تھے۔ گویا یہ دفتر لاہور کے ادبی مراکز میں سے ایک تھا۔ حیرت ہے کہ اتنے اہم ادبی جریدے کے مدیر اور سبھی اہم ادبی شخصیات کے ہم مجلس اس شخص میں خود نمائی نام کو بھی نہیں تھی۔ وہ کبھی اس بات پر بھی گلہ مند نہیں ہوئے کہ تعارفی دنوں میں ان کے دفتر میں روزانہ آنے والے احباب شہرت کے بعد ادھر کا رستہ ہی بھول گئے۔ وہ ان سب کا ذکر ہنستے مسکراتے ہوئے کرتے تھے۔ ان کی شخصیت اور کردار کا یہ مثبت پہلو مجھے ہمیشہ بہت اچھا لگا۔ مثلاً اُن دنوں جناب علیم ناصر صاحب اور خالد علیم صاحب فانوس کے دفتر تشریف نہیں لاتے تھے مگر کوئی دن ایسا نہ گیا ہوگا کہ فتدیر صاحب نے ان کا ذکر محبت سے نہ کیا ہو۔ وہ ان دونوں کے زبردست ادبی، شخصی اور سماجی پہلوؤں کے گرویدہ تھے۔

میرا مشاہدہ یہ رہا کہ قدیر صاحب کم از کم اُن دنوں تو بظاہر کم متحرک دکھائی دیتے تھے تاہم ان کی باتوں سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا کہ پیتے دنوں میں وہ کتنے مصروف اور فعال رہے ہوں گے۔ کبھی کبھی جب شام ڈھلے ہم دونوں جریدے کے لیے موصول ہونے والی تخلیقات ترتیب دینے میں کوشاں ہوتے تو باتیں کرتے کرتے وہ وہیں صوفی سے ٹیک لگائے اُلکھ جاتے اور کبھی بہت معصومیت سے سوہی جاتے جیسے زبان حال سے کہہ رہے ہوں:

جہاں نیند آئی، وہیں سو گئے

فقیروں کا کیا ہے، کہیں سو گئے

یہ فقیر حال مست کبھی کبھی اچانک جوش میں آجاتے اور پھر سے تنگ و دو کے ارادے باندھنے لگتے۔ ایک روز مجھے کہنے لگے کہ کالج سے کچھ روز کی چھٹی لے کر میں ان کے ساتھ پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کروں تاکہ ”فانوس“ کا احیا کیا جاسکے اور یہ کہ اس سے مجھے بھی خود کو متعارف کروانے کا موقع ملے گا۔ افسوس کہ اس پروگرام کو حتمی اور عملی شکل دینے کا موقع نہ مل سکا۔

زندگی نے سب کی طرح مجھے بھی سرد سفر روانہ رکھا، کبھی اندر کے سفر پر اور کبھی باہر کا سفر۔ جرمنی سے پاکستان اور پھر کینیڈا میں مستقل قیام نے تجربے کی صورت میں مجھے بہت کچھ دیا مگر دوستوں اور

خالد سلیم

قدیر شیدائی: یادوں کی برکھا

آج سے چوالیس سال پہلے، میری کوئی سترہ اٹھارہ سال کی عمر، یہ غالباً ۱۹۷۷ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، میں کراچی جاتے ہوئے، شاید ملتان ریلوے اسٹیشن تھا، چائے پینے کی خواہش میں کچھ دیر کے لیے ریل گاڑی سے اتر اتوٹی اسٹال سے تھوڑا آگے ایک بک اسٹال پر نظر پڑی۔ مطالعے کے شوق نے مجھے بک اسٹال کی جانب بڑھا دیا۔ رنگارنگ رسائل اور کتابوں سے سب سے بک اسٹال پر ”فنون“ اور ”سپ“ جیسے ادبی پرچے دیکھے، ایک ایک کر کے اٹھائے اور قیمت زیادہ ہونے کے باعث بھاری پتھر جان کر وہیں رکھ دیے۔ رسائل کی اگلی رومیں مختلف پرچوں کے درمیان ایک کم ضخامت کے حامل پرچے پر ایک تصویر دل کو بھاگتی۔ تصویر نہیں بلکہ کسی آرٹسٹ کے مٹوے قلم کا نتیجہ تھا۔ آرٹسٹ نے جس شخصیت کا اسکیچ کھینچا تھا اس کے ساتھ کتابوں کا ایک منار سا بنا ہوا تھا اور ہر کتاب کے تدرتہ پتھتے پر کتاب کے مصنف کے ساتھ کتاب کا ناما نوس نام۔ میں نے چہرے کو غور سے دیکھا جو کچھ جانا پہچانا سانسوس ہوا۔ کہاں دیکھا تھا؟۔۔ تو یاد آ گیا کہ ٹیلی ویژن پر جو ش ملیخ آبادی، احسان دانش، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی اور اس وقت کے دیگر معروف شعرا کے جھرمٹ میں داد و تحسین سے بے نیاز مشاعرہ پڑھتے ہوئے۔ ہاں تو یہ وہی عبدالعزیز خالد ہیں۔ پرچے پر ”ماہنامہ فانوس لاہور“ اور مدیر اعلیٰ کے طور پر قدیر شیدائی اور معاونین میں ایک دو نام اور درج تھے۔ قیمت کے لحاظ سے قابل حصول پایا تو میں پرچہ خرید کر واپس ریل کے ڈبے میں اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا کیوں کہ ریل چلنے کا وقت قریب تھا۔ یوں میرا اولین اور غائبانہ تعارف عبدالعزیز خالد اور قدیر شیدائی سے ہوا۔

لاہور واپس آیا تو پہلی فرصت میں پرچے پر درج پتے کی روشنی میں ماہ نامہ ”فانوس“ کا دفتر تلاش کیا۔ صبح کوئی دس گیارہ بجے کا وقت۔۔۔ گوردوار جن نگر کی ایک اسٹریٹ میں، جو چڑھ منڈی، گوال منڈی اور سرکلر روڈ کے سنگم میں واقع تھی، ”فانوس“ کے مختصر سے ایک کمرے پر مشتمل دفتر، کھلے دروازے سے کوئی گیارہ بارہ فٹ کے فاصلے پر بالکل سامنے زمانہ موہنجو ڈارو کے یادگار ایک صوفے پر ایک شخصیت نیم دراز حالت میں براجمان تھی۔ گہرا سیاہی مائل گندمی رنگ، چہرے کے نقش و نگار بھاری، بھاری بھر کم مگر گٹھا ہوا جسم، نیم دراز حالت میں بھی ہاتھ میں سگریٹ۔ میں نے دروازے میں کھڑے کھڑے قدرے جھجکتے ہوئے سلام کیا۔ نہ جانے اس وقت یہ شخصیت پراسرار سی کیوں معلوم ہوئی۔ ”کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟“ جسم کی طرح آواز بھی بھاری

پیاروں کی قربت چھین لی۔ عجب اتفاق ہے خالد سلیم صاحب کے ساتھ ہی مجھے قدیر شیدائی صاحب سے پہلی بار ملنے کا موقع ملا اور انہی کے توسط سے ان کے سفر آخرت کی اطلاع ملی۔ وہ بتا رہے تھے کہ قدیر صاحب اپنی اہلیہ کی موت کے بعد ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ فانوس کا دفتر جو کبھی رات گئے تک قہقہوں سے جگمگاتا رہتا تھا، اب اس میں یا تو قدیر صاحب ہوتے تھے یا اداس اور تہارت جگے جن میں وہ کہا کرتے تھے:

وحشت سی برسنے لگتی ہے دیوار دور سے شام ڈھلے
گھر سونا سونا لگتا ہے، آنکھوں سے نیندا اڑ جاتی ہے

آج سے چالیس برس پہلے کی بات ہے۔۔۔ اور اس جملے نے مجھے یادوں کے کیسے کیسے میلوں اور جھمیلوں کے سفر پر روانہ کر دیا ہے۔ اس گاہے بہت روشن، گاہے کم روشن سفر میں قدیر شیدائی صاحب بھی مجھے اپنی دنیا سے احساس کے پاس محسوس ہوتے ہیں جیسے آہستہ آہستہ گنگنا رہے ہوں:

آنکھوں میں سمائے رہتا ہے اپنوں سے بچھڑنے کا موسم
انسان چلا جاتا ہے مگر یادوں کی دھنک رہ جاتی ہے

بھرم۔۔ اور پھر بہ یک لمحہ اتنے سوالات۔۔ میں بوکھلا سا گیا۔۔ ”جی! قدیر شیدائی صاحب سے۔“ اتنی دیر میں ہاتھ میں دھواں چھوڑتا سگریٹ انھوں نے ہونٹوں میں دبایا۔ قدرے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور پاؤں صوفے سے نیچے رکھتے ہوئے سامنے بڑی چھوٹی سی میز کو قدرے آگے کھسکا یا، سگریٹ واپس ہاتھ میں لے کر دھوئیں کا ایک مرغولہ چھوڑا۔ پھر وہی بھاری آواز: ”ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔“۔۔ کمرے کے اندر دائیں جانب پرانی قسم کی تین چار کرسیاں بڑی تھیں۔ میں چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو انھوں نے میری جانب غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا: ”شاعر ہو یا افسانہ نگار؟۔۔ اور نام کیا ہے؟“ اب کے آواز میں قدرے نرمی تھی۔ میں نے نام بتایا اور کہا: ”دونوں۔“ ان کی آنکھوں میں ذرا سی چمک پیدا ہوئی اور کہا: ”اچھا۔۔ یہ دونوں بھی خوب ہے۔۔۔“ اب یاد نہیں مزید کیا کیا پوچھا اور کیا کچھ میں نے بتایا، البتہ اتنا یاد ہے کہ میرے نام کے لاحقے سے انھیں کچھ خیال گزرا، چونکہ کر میری جانب دیکھتے ہوئے میرے غلصے کے بارے میں استفسار کیا اور پھر والد صاحب کا نام پوچھا۔ ”علیم ناصر۔“ میں نے انھیں نام بتایا تو پوچھنے لگے، ”کیا انھوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟ میں نے کہا، نہیں میں تو آپ کا پرچہ پڑھ کر یہاں تک پہنچا ہوں، جو میں نے سفر کے دوران میں خریدا تھا۔ مجھے اُن کے چہرے کے تاثرات سے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی انوکھی بات کہہ دی ہو۔ کہنے لگے، ”عجیب اتفاق ہے ابھی چند روز پہلے پروفیسر خالد بزمی صاحب نے ”فانوس“ کے عبدالعزیز خالد نمبر کے لیے انھی کا نام تجویز کیا ہے۔ میری اُن سے بات بھی ہو چکی ہے۔ فانوس کی ادارت کے لیے میں نے علامہ صاحب کو رضامند کر لیا ہے اور اب مدیر کے طور پر عبدالعزیز خالد نمبر وہی مرتب کریں گے۔ (بعد میں بھی دیکھا گیا کہ وہ والد محترم کو علامہ صاحب ہی کہہ کر مخاطب کرتے تھے)۔ مجھے خاصی خوشی ہوئی مگر اس بات پر حیران بھی تھا کہ والد صاحب نے مجھ سے اس بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔

یہ سردیوں کے دن تھے۔ ان کی شخصیت کی طرح گوروار جن نگر کے محلے میں واقع اس دفتر کا ماحول خاصا پُراسرار محسوس ہوتا تھا۔ تقسیم سے قبل کی دیواریں، جگہ جگہ پلستر جھڑیں اور رنگ و روغن سے بے نیاز۔ ان کے بائیں جانب ایک چھوٹی سی ترپائی پر بے ترتیب پڑے کاغذات، ایک کونے میں رسائل کے ڈھیر بکھرے ہوئے۔ پورے کمرے میں ایک ہی چیز اس وقت جاذب نظر تھی اور وہ تھا کالے رنگ کا راج الوقت ٹیلیفون سیٹ، جس کا رسیور اگر ہاتھ میں پکڑیں تو ذرا سی بے احتیاطی کے باعث ناک سے جا ٹکرائے۔ آج کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں۔ بعد میں دیکھا گیا کہ ”فانوس“ کی باقاعدہ ماہانہ اشاعتوں کے ساتھ ساتھ ایک نیگم (بھابھی صاحبہ شاپین کوثر) جو بالائی کمرے میں اپنے مختصر گھر یلو سامان کے ساتھ مقیم تھیں اور ایک یہ ٹیلیفون سیٹ اُن کی کل کائنات تھی۔ البتہ اس کائنات

کے مرکزی اجزاء کے علاوہ ان کی ادبی وابستگیوں اور سرگرمیوں کے شواہد وہ شعر اور ادا با تھے جو اس چھوٹے سے دفتر کی پُراسراریت کو مانوسیت میں بدل کر ماحول میں خوش گواری کا عنصر پیدا کر دیتے تھے۔ آج کے دور میں کسی ادبی دفتر کی عمارت جب تک شان دار اور ظاہری چمک دمک سے آراستہ نہ ہو، ہمارے کئی اہل ادب وہاں قدم رکھنا گوارا نہیں کرتے۔ جب کہ قدیر صاحب کا دفتر ”فانوس“ وہ ادبی نگار خانہ تھا جس میں بڑی بڑی مجسم اور سانس لیتی تصویریں آویزاں رہتی تھیں۔ عبدالحمید عدم، منیر نیازی، عبدالعزیز خالد، نظیر لدھانوی، نور بجنوری، حافظ امرتسری اور ایسی کئی شخصیات کو دفتر کی ظاہری ہیئت سے بے نیاز ”فانوس“ کی ادبی کشش کھینچ کر وہاں لاتی تھی۔ وہاں ایسی کتنی ہی شخصیات تھیں جنھیں قدیر شیدائی صاحب نے ایک بے لوث ادبی مرکز فراہم کر رکھا تھا۔ خاص طور جو نام مجھے یاد آ رہے ہیں، ان میں ناصر زیدی، مستنصر حسین تارڑ، عطاء الحق قاسمی، تحسین فراقی (موجودہ ڈاکٹر تحسین فراقی)، علی ظہیر منہاس، پروفیسر خالد بزمی، خالد شفیق، شاد شیدائی، قائم نقوی، بلبلخ الدین جاوید اور بہت سے دیگر اہل ادب دفتر ”فانوس“ میں وقفے وقفے سے تشریف لایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی راولپنڈی سے سلطان رشک اور گجرات سے شمس کاشمیری لاہور آتے تو ان کا ایک ٹھکانہ قدیر صاحب کا دفتر ہی ہوتا تھا۔ اور بھی کئی نام ہیں۔ البتہ نور بجنوری صاحب اور منیر نیازی صاحب کو میں نے اکثر وہاں دیکھا۔ نور صاحب ملٹری اکاؤنٹس میں ملازم تھے۔ شام کے وقت قدیر صاحب سے ملنے آجاتے اور رات گئے تک ان کے ہم نشین رہتے۔ نہایت شریف النفس انسان لیکن طبیعت میں کچھ آزاد روی بھی تھی، البتہ والد صاحب کا بہت احترام کرتے تھے۔ ایک بار مجھے کہا کہ اپنی کوئی چیز سناؤ۔ میں نے علامہ اقبال کی مسجد قرطبہ کی بحر میں کچھ اشعار سنائے تو والد صاحب سے ملاقات پر ہنسی ہنسی میں کہنے لگے کہ اس نوجوان کی شادی کر دیں، آسان بحروں میں شعر کہنے لگے گا۔ والد صاحب اُن کی بات سن کر ہنس دیے۔ (بالا اتفاق یہی بات میرے بارے میں ایک بار اردو اور فارسی کے معروف شاعر صوفی افضل فقیر (مرحوم) نے بھی والد صاحب سے کہی تھی۔)

منیر نیازی صاحب سے جب پہلی بار ”فانوس“ کے دفتر میں میری نیاز مندگی ہوئی تو وہ جوانی کے سنہرے ایام گزرنے کے باوجود ایک وجیہہ الجشہ اور خوب رُوجوان تھے۔ سُرخ و سفید اور پُرکشش چہرہ، مایا لگی سفید رنگ کی شوارٹس میں ملبوس، پاؤں میں تلے دار گھسٹا۔ کون نہیں جانتا کہ وہ کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں تھے۔ اکثر ریڈیو پاکستان یا پی ٹی وی کے کسی پروگرام کے بعد واپسی پر دفتر ”فانوس“ میں دروازے سے داخل ہوتے ہوئے بائیں جانب کے صوفے پر آ کر بیٹھتے تھے اور یوں لگتا تھا کہ اب یہ صوفہ تھا صرف اُن کے لیے ہے، باہر سے آنے والے کسی اور شخص کو یہ ہمت نہیں تھی کہ وہ ان کے ساتھ آ کر بیٹھے۔ اڈل تو ظاہر ہے کہ یہ ان کا صرف احترام ہی نہیں بلکہ ان کی

کتاب کی اشاعت کے بعد ”فانوس“ میں نیازی صاحب نے والد صاحب کو تبصرے کے لیے کہا تو انہوں نے تبصرہ کر کے ”فانوس“ میں شائع کر دیا۔ مندرجہ تبصرے میں بعض فی اعتراضات بھی درج تھے۔ مثلاً ”راتوں کا پچھلا پہر“ میں جمع اور واحد کا تضاد اور پھر اس لفظ ”پہر“ کو ساکن نہیں بلکہ متحرک ہونا چاہیے تھے۔ اس کے استناد میں اساتذہ سخن کی مثالیں بھی درج تھیں، تاہم قاضی پہلی کیشنرز کے قاضی صاحب نے تبصرہ پڑھا تو نیازی صاحب سے کہا کہ یہ تبصرہ آپ کی شہرت اور مقام کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور پھر اعتراض بھی غلط ہے۔ نیازی صاحب قدیر صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ ”قدریر! یہ علامہ صاحب نے کیا کیا، میرے تو مقام ہی کو خطرے میں ڈال دیا۔“ قدریر صاحب نے کہا، خاں صاحب! علامہ صاحب نے درست اعتراض کیا ہے، آپ اسے خاطر میں نہ لائیں۔ نیازی صاحب نے نہایت معصومیت سے صرف اتنا کہا، ”اچھا۔“ حیرت ہے کہ نیازی صاحب نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لی اور والد صاحب کے دفتر آئے پر ان سے کہا، آپ کے اعتراضات درست ہیں مگر یہ غزل اتنی مقبول ہو چکی ہے کہ کسی کی اس جانب توجہ نہیں جاتی۔“

میں اگرچہ اُس وقت مشاہدے اور شعور کی اس منزل تک نہیں پہنچا تھا کہ کسی کی مجموعی شخصیت کا جائزہ لے کر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم کر سکوں، اور عملاً یہ خوبی شاید اب بھی مجھ میں موجود نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت بھی مجھے منیر نیازی صاحب کی شخصیت میں ایک معصومانہ کردار کی جھلک نظر آنے لگی تھی اور یہ میرا نہیں بلکہ قدریر صاحب کی نیازی صاحب کے بارے میں رائے تھی اور خود نیازی صاحب میں بھی اپنی ظاہری و باطنی سچائی کا عملی مظاہرہ کئی بار دیکھنے کو ملا۔ بالکل ایک کھرے سچے اور اپنی تکتہ آفرینیوں کے باوجود طبیعت کے لحاظ سے ایک معصوم انسان۔۔۔ ایک بار ”فانوس“ کے دفتر میں منیر نیازی صاحب، عبدالعزیز خالد، والد گرامی (علیم ناصر) اور نور بجنوری بہ یک وقت موجود تھے۔ اچانک خالد صاحب نے، جو قدریر صاحب کے کچھ قریب بیٹھے تھے، دھیمی آواز میں کوئی بات کہی۔ جانے کیا معاملہ تھا کہ قدریر صاحب نے نیازی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”خاں صاحب وہ۔۔۔ وہ!“ نیازی صاحب نے پوچھا: ”کیا۔۔۔ یعنی کیا؟“ تو قدریر صاحب نے کہا: ”خالد صاحب سے متعلق۔۔۔ وہ کل والی بات“۔ ہم سب نیازی صاحب اور قدریر صاحب کو تجسس سے دیکھنے لگے تو نیازی صاحب نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا: ”قدریر! مجھے خالد صاحب کا کلام سمجھنے کے لیے تین چار سو سال تو دو۔“ سب ہنس دیے اور معاملہ کھلا کہ خالد صاحب اپنے بارے میں نیازی صاحب کی رائے لینا چاہتے ہیں۔ سب نے خالد صاحب کی جانب دیکھا۔ وہ ذرا سا جھینپ گئے تھے لیکن پھر خود کو سنبھالتے ہوئے کہا: ”میرا تو خیال تھا کہ نیازی صاحب سمجھ بوجھ والے آدمی ہیں،“ اور پھر اپنے خاص انداز میں بڑی دیر تک بیٹھتے رہے۔ نیازی صاحب نے جانے کیا سمجھے،

زُعب دار شخصیت کا ایک پہلو بھی تھا۔ دوسرے اُن کی ”لال پری“، جو ایک بوتل میں مقید یعنی ڈھکن بند، صوفے کے نیچے چھپی رہتی تھی، بوتل سے نکل کر حسب ضرورت ان کے گلاس تک پہنچتی تو کسی دوسرے کے لیے یہ مشکل ترین مرحلہ ہوتا کہ وہ اس کی ”خوشبو“ کی قربت سے حظ اٹھا سکے۔

قدریر شیدائی صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے بعض ساتھ والوں کو ان کے نام سے کم ہی پکارتے تھے۔ ہر کسی کے لیے انہوں نے کوئی نہ کوئی لقب چن رکھا تھا۔ والد صاحب کو احتراماً علامہ صاحب، اور جہاں تک یاد ہے، تحسین فراقی صاحب کو مولوی، اور دو تین دیگر اصحاب کو وہ انتہائی دل چسپ قسم کے القاب سے یاد رکھتے تھے۔ ایک وقت میں زاہد بلند شہری اکثر ”فانوس“ کے دفتر میں آیا کرتے تھے اور ایک صاحب، اقبال شاہ یونائیٹڈ بینک میں آفیسر، اُن کے بچے دوستوں میں سے تھے، اُن دونوں کے اہل زبان ہونے کی وجہ سے انہیں ”بھیا“ کا لقب دے رکھا تھا، لیکن عام حالات میں وہ اقبال شاہ گوشاہ صاحب ہی کہتے تھے۔ (افسوس کہ اقبال شاہ، قدریر صاحب کی وفات کے چند روز بعد ہی سفر آخرت اختیار کر گئے)۔ سلطان رشک (”نیرنگ خیال“ کے مدیر) اور ایک دو اور اصحاب ان کے بہت ہی الگ قسم کے معنی خیز القاب کی زد میں رہتے تھے، البتہ منیر نیازی صاحب کو وہ عزت و احترام کے ساتھ خاں صاحب کہا کرتے تھے۔

ایک بار، جب منیر نیازی صاحب صوفے پر بیٹھے ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ ساتھ اپنے شغل خاص میں منہمک تھے اور میں دوسری جانب ایک کرسی پر متمکن تھا تو قدریر صاحب چون کہ دفتر کے دروازے کے بالکل سامنے المٹارنگ کے ایک پرانے صوفے پر بیٹھے رہتے تھے، انہوں نے باہر والد صاحب کو اپنے سائل سے اُترتے دیکھ کر منیر نیازی صاحب کو خبر دی: ”خاں صاحب! علامہ صاحب آگئے ہیں۔“ نیازی صاحب نے، جو ابھی کو ٹاکم رہ جانے کے باعث لال پری کو گلاس میں انڈیلنا چاہتے تھے، جھٹ بوتل کا ڈھکن بند کیا اور بوتل اور خالی گلاس کو صوفے کے نیچے چھپا کر یوں بیٹھ گئے جیسے صدیوں کے پیاسے ہوں۔ ہمارے ایک دوست کا فرمانا ہے کہ نیازی صاحب کسی کی عزت نہیں کرتے تھے جب کہ یہ واقعہ میری آنکھوں کے سامنے رُونا ہوا چکا ہے اور انہیں جان لینا چاہیے کہ خود نیازی صاحب کا ظرف کس معیار کا تھا اور اُن کے نزدیک ایک باریش بزرگ اور عملی شخصیت کی کیا حیثیت تھی۔

میں نے دیکھا کہ نیازی صاحب قدریر شیدائی صاحب کا بھی بہت احترام کرتے اور اُن کی کسی بات کو ٹالتے نہیں تھے۔ اس حوالے سے ایک واقعہ مجھے اکثر یاد آ جاتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں قاضی پہلی کیشنز لاہور نے نیازی صاحب کی غزلوں کا ایک انتخاب ”اُس بے وفا کا شہر“ کے نام سے شائع کیا۔ اسی نام سے ان کی معروف غزل ”اُس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو“ بھی اس میں شامل تھی۔

والد صاحب کی جانب دیکھ کر مسکرائے اور کہا: ”علامہ صاحب! آپ خالد صاحب کے بارے میں چند سطر میں لکھ دیں، میں دستخط کر دوں گا۔ اب یاد نہیں کہ والد صاحب نے کیا جواب دیا، البتہ محفل زعفران زار بن گئی۔۔۔ کئی سال بعد جب قدیر صاحب کو میں نے یہ واقعہ یاد دلایا تو کہنے لگے، دراصل عبدالعزیز خالد پر لکھنے کی خواہش کا اظہار منیر نیازی صاحب سے میں نے خود کیا تھا اور خالد صاحب سے کہہ دیا تھا کہ وہ بھی آپ کی شاعری پر رائے دیں گے، لیکن جب منیر نیازی صاحب کو خالد صاحب کے دو تین مجموعے دیے گئے تو انھوں نے ورق گردانی کے بعد کہا، قدیر! اس جناتی شاعر پر لکھنے کے لیے پہلے مجھے ہوا بازی سیکھنی پڑے گی۔

جب ایک جانب عبدالعزیز خالد نمبر ترتیب دیا جا رہا تھا اور دوسری جانب ہر ماہ کے شمارے کا سرورق خالد صاحب کی تصویر کے نیچے اس نمبر کی عن قریب آمد کے اعلان نیز تقریباً ہر شمارہ ان کے بارے میں ایک دو مضامین کی شمولیت کے ساتھ شائع ہوتا تھا تو قدیر صاحب نے بہت بعد میں بتایا کہ ایک روز خالد احمد، نجیب احمد اور حلقہ فنون کے ایک دو اور شاعر ان کے پاس آئے تھے۔ خالد احمد نے کہا کہ آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں، آپ نے احمد ندیم قاسمی اور فیض احمد فیض کے ہوتے عبدالعزیز خالد کو شاعر اعظم تو بنا دیا، اب نمبر شائع کر کے مزید کتنا بڑا شاعر بنائیں گے۔ میں نے کہا کہ ہم انھیں بڑا کیا بنائیں گے، وہ پہلے ہی بہت بڑے ہیں، ہم تو صرف اعتراف کر رہے ہیں۔ آپ نے اعتراف نہیں کیا لیکن ہمیں تو اعتراف کرنے دیں۔ میں نے پوچھا کہ خالد احمد صاحب نے کیا جواب دیا۔ کہنے لگے، اس وقت تو کچھ نہیں کہا، چائے پی، گپ شپ کی اور پھر اٹھ کر چلے گئے، البتہ دو تین بار بعد میں آئے اور پوچھتے رہے کہ آپ کا ”شاعر اعظم نمبر“ کب تک آ رہا ہے۔

اسی زمانے میں دفتر فانوس کی گلی میں دوسری سمت ایک صاحب تھے جو ”خزینہ مشرق“ کے نام سے ایک ہفت روزہ نکالتے تھے۔ غالباً ہومیو پیتھک ڈاکٹر بھی تھے، باوجود کوشش کے اس وقت مجھے ان کا نام یاد نہیں آ رہا۔ وہ اکثر اپنے دفتر میں کم اور قدیر صاحب کے دفتر میں زیادہ دیکھے جاتے تھے۔ چوں کہ پینلرز پارٹی کے ہم نوا تھے، قدیر صاحب سے اکثر بحث مباحثے میں بھٹو صاحب کی خوبیاں گنویا کرتے۔ قومی انتخابات کے بعد جب دھاندلی کا شور مچا تو کچھ خاموش سے رہنے لگے۔ انھی دنوں قومی اتحاد کی ملک گیر تحریک شروع ہو گئی۔ لاہور کے جلسے جلسوں میں جب نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا اور مال روڈ پر پولیس کی جانب سے ایک جلوس پر گولیاں برسائی گئیں تو تین چار نوجوان مارے گئے جن میں ایک میرے محلہ دار دوست بھی گولی کا نشانہ بنے۔ وہ اکثر میرے ساتھ ”فانوس“ کے دفتر آیا جایا کرتے تھے۔ ان کی شہادت کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھے کہنے لگے کہ تم بھی نوجوان ہو، تم کیوں نہیں اس تحریک میں حصہ لیتے۔ میں احتراماً چپ رہا مگر قدیر صاحب

نے فوراً کہا، میرے مدد پر معاون کو شہید کروا کر آپ کو کیا مل جائے گا۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگے: ”محبت مجھے ان جوانوں سے ہے۔۔۔ ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند۔“ چوں کہ قومی اتحاد کی تحریک ناعد سیاسی جماعتوں پر مشتمل ”نوستاروں“ کے نام سے پہچانی جاتی تھی، قدیر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا، یہ تو اور بھی خطرناک بات ہے، گویا آپ چاہتے ہیں کہ خالد علیم نوستاروں پر کمند ڈالے۔ اول تو ایسا ہوگا نہیں، اور اگر ایسا ہوا بھی تو کم از کم علامہ صاحب باوجود اکلوتا بیٹا ہونے کے اسے گھر سے نکال دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب ہنسنے لگے، اور پھر بعد میں دیکھا گیا کہ جب جرنل ضیاء الحق نے ہسٹو صاحب کو گرفتار کر کے مارشل لاء نافذ کیا تو وہ ضیاء الحق کے بڑے حامیوں میں سے تھے جس پر قدیر صاحب نے کہا کہ اب ”خزینہ مشرق“ مغرب سے طلوع ہوگا۔

قدیر صاحب کے اس دفتر کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر کسی کے لیے کھلا رہتا تھا۔ قدیر صاحب دفتر میں ہوں، تب بھی، اور اگر کسی کام سے باہر گئے ہیں، تب بھی آنے والا دفتر کا بند دروازہ دیکھ کر واپس نہیں جاتا تھا بلکہ دروازے پر لگی بے قفل گرل کھول کر دروازے کے دونوں پٹ اندر کی جانب دھکیلتا اور آرام سے کرسی یا صوفے پر بیٹھ جاتا۔ اوپر سے آواز آتی، ”کون؟“، جواب پا کر یوں خاص متعلقین کے لیے چائے بھی آجاتی۔ قدیر صاحب نے ایک بار مجھے بتایا کہ ان کی شادی سے پہلے ساغر صدیقی اکثر یہاں آیا کرتے تھے۔ ایک بار وہ کسی کام سے باہر گئے اور جب واپس آئے تو کمرے میں چرس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس پر انھوں نے یہ شعر کہا:

ملنے نہ آگئے ہوں کہیں آج وہ قدیر کمرے میں ہے رچی ہوئی خوشبو گلگاب کی
قدیر صاحب کے شخصی و ادبی مقام کی یہ ایک جھلک ہے ورنہ پیش تر واقعات ایسے ہیں جو گاہے گاہے یاد آتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اہل ادب میں ان کا ایک خاص احترام تھا۔ میں نے ان کے ساتھ کم وبیش زندگی کے پچیس چھبیس سال گزارے ہیں، اگرچہ درمیان میں بعض وجوہات کے باعث دو تین سال کا تعطل بھی آیا، اور اسی تعطل کے کسی دورانیے میں میری خواہش پر سید حامد بزدانی کو مدیر ثانی کے طور پر بارادارت سونپا گیا اور حامد نے یہ ذمہ داری اپنی پوری ادبی صلاحیتوں کے ساتھ مجھ سے کہیں بڑھ کر نبھائی، اور خود مجھے اس تعطل کا نتیجہ یوں بھگتنا پڑا کہ ایک روز میں اور حامد بزدانی ”فنون“ کے دفتر (واقعہ میکلوڈ روڈ) خالد احمد صاحب سے ملنے گئے تو وہ مجھے دیکھتے ہی سخت ناراض ہوئے اور کہنے لگے، تم نے ”فانوس“ کیوں چھوڑا؟ میں کسی وجہ سے قدیر صاحب کے بارے میں شکوہ گزار ہوا تو کہنے لگے، مدیر ایسے ہی بن جاتا ہے آدمی۔ میں نے محسوس کیا کہ مزاحمت بے کار ہے، لہذا میں خاموش رہا۔۔۔ اور پھر واضح تھا کہ اس تعطل میں میرے تساہل اور کوتاہ بینی ہی کو زیادہ دخل تھا ورنہ ان کی جانب سے ان کا درمیخانہ ہر ادیب و شاعر کے لیے کھلا تھا۔ کون آیا، کون گیا، وہ اس پر زیادہ کھل

لیے چائے باہر سے آتی تھی لیکن کچھ مدت بعد انہوں نے یہ معمول ترک کر دیا اور باہر سے صرف دودھ منگوایا اور اپنی پوری بھاری بھر کم آواز کے ساتھ بھابھی کو دودھ اوپر لے جانے اور چائے کے لیے پکارا، یا سامنے گلی سے کسی بچے کو آزدی۔ ان کا حکم کوئی نہیں نالتا تھا۔ بچہ بگا بگا آیا اور دودھ اوپر دے آیا۔ پھر گلی کی جانب ایک رسی سے بندھی ہوئی چھینکا نما ٹوکری کھلے دروازے کے سامنے دکھائی دینے لگی۔ بعض اوقات باہر کھڑے کسی لڑکے کو آزدی اور کبھی کبھی حسب ضرورت چائے کے کپ بے تکلف مہمانوں نے خود ہی اٹھالیے۔

اُن کے دماغ میں کھانا کھانے والوں کی ایک فہرست بھی موجود رہتی تھی۔ کوئی خالی پیٹ آیا ہے تو انہیں خود ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اسے کھانے کی حاجت ہے۔ اُن کی ایک آواز پر بالائی حصے میں بھابھی کھانا تیار کر کے نیچے لے آتیں۔ تاہم بھابھی صاحبہ اور قدیر صاحب میں ایک شاعرانہ تصفاد فطری امر تھا۔ بھابھی صاحبہ روزہ دار اور نماز کی پابند، اور قدیر صاحب ان پابندیوں سے بے نیاز، مگر آفرین ہے اس خاتون پر کہ روزے کی حالت میں بھی قدیر صاحب اور ان کے دوستوں کے لیے دوپہر کا کھانا تیار ملتا تھا اور چائے کا دور تو وقفے وقفے سے چلتا ہی رہتا تھا۔ یوں رمضان المبارک کے دنوں میں بھی قدیر صاحب اور ان کے دوستوں کی عیدی ہو جاتی تھی بلکہ یہ عیدی یوم عید سے بھی سوا ہوتی تھی۔ بہت سے ایسے اصحاب، جو عام دنوں میں کم یاب ہوتے تھے، رمضان المبارک کے ایام میں دفتر فانوس میں وافر پائے جاتے تھے۔ سگریٹ اور چائے میری بھی کمزوری تھی، سو جس دن روزہ چھوڑا، بھاگ بھاگ دوپہر کے وقت ”فانوس“ کے دفتر میں حاضر۔۔۔ ایک بار کسی ایسے ہی موقع پر میں نے علامہ اقبال کے شعر میں ذرا سائنس تصرف کرتے ہوئے کہا:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مرد ”قدیر“
خیر ایسی بہت سی باتیں ہیں جو قدیر صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو رکھتی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ”فانوس“ کی اکثر اشاعتیں اُن کی ان مہمان نوازیوں کے باعث معرض التوا میں رہنے لگیں۔ عبدالعزیز خالد نمبر کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہوا۔ والد گرامی علیم ناصری (سرحوم) کی ادبی معاونت سے پورے کا پورا نمبر تیار ہو گیا۔ کتابت کا زمانہ تھا۔ کسی طرح ایک ہزار صفحات کا نمبر کتابت کے مرحلے سے گزرتو گیا لیکن طباعت کے لیے ”چیل کے گھونسلے میں ماس نہیں“ والا معاملہ پیش آ گیا۔ دراصل یہ نمبر ایک دو صاحبان کے مالی تعاون اور کراچی کی بعض کمپنیوں کے اشتہارات سے شائع ہونے کی توقع تھی۔ اس کے لیے قدیر صاحب اور میں نے کراچی کا سفر کیا اور ان کمپنیوں میں اشتہارات کے حصول کے لیے پہنچے۔ خیال تھا کہ خالد صاحب ان کمپنیوں کو اپنے خاص تعلق کی بدولت اشتہارات کے لیے کہیں گے۔ خالد صاحب ان دنوں کراچی میں اپنے کسی کام کے لیے میسر ہوئے

کر اظہار نہیں کرتے تھے، بس نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں نمایاں ادبی مستام پر دیکھنے کے متمنی رہتے تھے۔ آج کے معروف دانش ور اور مزاح گو شاعر انعام الحق حب وید اور میں ایک ہی دور میں ”فانوس“ کی ادارت میں شریک تھے۔ انعام الحق جاوید اپنی خاص ادبی صلاحیتوں کے ساتھ بہت آگے تک پہنچے اور مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اب ماشاء اللہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹر کے طور پر متعین ہیں۔ معروف غزل گو شاعر انجم رومانی کی بیٹی سے انعام کا رشتہ ازدواج بھی قدیر صاحب اور بیگم قدیر کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک بار بیگم قدیر نے میرے رشتے کے لیے بھی ایک تجویز والد صاحب کو پیش کی۔ والد صاحب تیار ہو گئے مگر میں ازل کا کم سواد، اس رشتے سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ کچھ تو خود انعام الحق جاوید کی ادیبانہ صلاحیتیں اور کچھ قدیر صاحب کے مشفقانہ بڑھاوے۔ مجھے یاد ہے کہ وہ بطور خاص ان کے لیے کوشاں رہتے تھے اور اُن کے ”راج آلوقت ٹیلیفون“ کا ڈائل اسلام آباد اور راولپنڈی تک گھوم جاتا تھا۔ وہ مجھ پر بھی اتنے ہی مشفق و مہربان تھے مگر میں یہاں بھی اپنی کم سوادی اور نالائقی کے باعث ان کے ”بڑھاوے“ میں نہ آسکا۔

قدیر صاحب مالی وسائل کی کمی مانگی کے باوجود یقین محکم کی دولت سے مالا مال تھے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور فیسی امداد پر بہت زیادہ بھروسہ رکھتے تھے۔ میں انہیں اکثر یاد دلاتا کہ ”عبدالعزیز خالد نمبر“ شائع ہونا چاہیے اور اس کے لیے آپ کو وسائل پیدا کرنے چاہئیں۔ جواب میں کہتے کہ ان شاء اللہ وسائل ضرور پیدا ہوں گے۔ میں تب تک ان سے بہت بے تکلف ہو چکا تھا۔ انہیں کہتا کہ بیٹی بھی ممکن ہے اگر آپ یہ صوفہ چھوڑیں گے۔ ایک روز میں کچھ زیادہ اصرار کرنے لگا تو کہنے لگے: ”خالد تم نہیں جانتے، اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور ضرور ہوگی۔ وہ چاہے تو چھت پھاڑ کر وسائل کا مینہ برسادے۔“ میں نے از رہ مزاح کہا کہ وسائل کا مینہ برس نہ برسے لیکن چھت کے پھٹنے سے بھابھی ضرور نیچے آگریں گی اور ممکن ہے، اگر بیچ گئیں تو زیادہ چوٹیں آنے سے علاج معالجے پر ضرور اچھی خاصی رقم صرف ہو جائے گی۔ میرا جواب سُن کر مجھے بڑی گہری نظر سے دیکھا اور پھر کہنے لگے: ”تمہارا ایمان کمزور ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔“

اکثر اوقات یوں ہوتا کہ ”فانوس“ جیسے تیسے کاغذ کے انتظام کے بعد پر لیں بھیج دیا گیا مگر طباعتی اخراجات میں کمی آگئی۔ جو رقم ”فانوس“ کے اشتہارات کے بدل میں ملتی، وہ پہلے ہی سے مہمان نوازی اور دیگر اخراجات کی مد میں چسپی جاتی، حال آں کہ جتنے اشتہارات کی رقم ”فانوس“ کو ملتی تھی اس سے صرف ”فانوس“ کے تمام اخراجات ہی پورے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ گھر کے اخراجات کے لیے بھی کافی تھے لیکن حساب کتاب کی انہیں عادت نہیں تھی اور بلا کے شاہ خرچ بھی تھے۔ دفتر میں کوئی بھی آیا، کم از کم چائے کے بغیر نہیں جاسکتا تھا۔ شروع شروع میں میں نے دیکھا کہ آنے والے کے

ہوتے تھے اور یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان بہت کچھ چھپائے ہوئے بھی اپنے اندروں کے کچھ اجزا کو چھپانے پر قادر نہیں۔ دیکھنے والوں نے بہت کم انھیں ہنسنے ہوئے دیکھا ہے۔

یہ محض اُن کی طبیعت کا تقاضا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ان کے وہ خانگی حالات ہیں جو امرتسر میں پاکستان ہجرت کرتے ہوئے ان پر اثر انداز ہوئے۔ تقسیم کے وقت کن کن خاندانوں پر کیا کیا سناخت گزرے، تاریخ کا ایک الم ناک باب ہے۔ قیام پاکستان کے وقت قدیر صاحب کی عمر آٹھ نو برس سے زیادہ نہیں تھی اور والدین اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی بڑی بہن بھی جن کی انگی تھام کروہ پاکستان آئے تھے۔ ان کی اس بہن نے، جنھیں وہ خود ہی نہیں، سب ہی آپا کہتے تھے، سکول ٹیچر کے طور پر ملازمت اختیار کی اور قدیر صاحب کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا فریضہ پوری ذمہ داری سے نبھایا۔ جوانی میں قدم رکھنے کے بعد بھی ایک طویل مدت تک قدیر صاحب بن بیابا رہے اور طبی طور پر شعروادب میں اپنا وقت صرف کرتے رہے جب کہ بہن کے اصرار کے باوجود شادی کی جانب مائل نہ ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اخراجات میں اس وقت تک خود کفیل نہ تھے۔ بہن ہی ان کی کفالت کرتی تھیں۔ ۱۹۶۰ء میں انھوں نے کچھ ذرائع پیدا کر کے ”فانوس“ کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا۔ اس دور میں چوں کہ ادبی پرچے بھی کچھ تو فروخت کے ذریعے اور کچھ اشتہارات کے ذریعے نہ صرف خود کفیل ہوتے تھے بلکہ آمدن کا وسیلہ بھی تھے، قدیر صاحب مانی طور پر خود کفیل ہوتے گئے۔ ادھر آپا، جو ایک مدت سے ان کی شادی کے لیے کوشاں تھی، موقع غنیمت دیکھ کر انھیں شادی کے لیے رضامند کر لیا اور پھر ۱۹۷۴ء کے لگ بھگ ان کی شادی بیگم شائین کوثر سے ہو گئی۔ یوں اُن کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔ بعد ازاں ان کے گھر میں دو ننھے ننھے پھول کھلے۔ ایک اُن کا بیٹا مدثر قدیر، جب ہم عبد العزیز خالد نمبر کے اشتہارات کے لیے کراچی میں سرگرداں تھے تو اس کی پیدائش کی خبر وہیں ملی۔ میں نے کہا، لیجیے قدیر صاحب مبارک ہو، ایک اشتہار تول گیا۔۔۔ دوسری ان کی بیٹی عطیہ قدیر، جس کی ماشاء اللہ شادی ہو چکی ہے اور دبئی میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم ہے۔ ان دونوں بچوں کی پرورش اور تعلیم کے لیے قدیر صاحب نے مالی مشکلات کے باوجود بہت محنت کی۔ خود جیسے تیسے گزار لی مگر ان کی تعلیم و تربیت پوری شفقتِ پدیری کے ساتھ کی۔

ان کی غزلوں میں جو عشقیہ جذبات کی کارفرمائی نظر آتی ہے، بظاہر ان کی طبیعت کا وہ خاصا نہیں جو اُن کی شخصیت کے خدوخال سے الگ ایک اور طرح کا زاویہ نگاہ رکھتا ہے۔ یہ اُن کے فطری طور پر عشقیہ جذبات کے وہ مظاہر ہیں جو اُن کے ایام جوانی کی ناکام آرزوؤں اور خاموش جذبوں سے پیدا ہوئے۔ اس شاعری کو وہ طاق نسیان کی نذر کر چکے تھے۔ ان کی وفات سے پانچ چھ سال پہلے ایک

کے ایک کمرے میں ٹھہرے تھے۔ ہم وہاں پہنچے اور اُن کی منگوائی گئی پڑ تکلف چائے پینے کے بعد جب ان سے اشتہارات کے لیے سفارش کرنے کو کہا تو اُنھوں نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ میں نے آپ سے ان کمپنیوں کی صرف نشان دہی کی ہے کہ یہ آپ کو اشتہارات دے سکتی ہیں مگر میں انھیں حکم نہیں دے سکتا۔ یہ سراسر اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے مترادف ہوگا۔

عبد العزیز خالد نمبر کے لیے ہمارا یہ سفر اگر چہ رائج کیا گیا تاہم میرے لیے ایسا رائج بھی نہیں کہ قدیر شیدی صاحب کے توسط سے وہاں بہادر شاہ ظفر مارکیٹ میں نقاد و محقق محترم کامل القادری کے دفتر میں قیام کرنے کے دوران میں نہ صرف ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا بلکہ ماہ نامہ ”افکار“ کے محترم مدیر سے بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور ”جوش نمبر“ اور ”احمد ندیم قاسمی نمبر“ کا حصول (بہ معاوضہ) ممکن ہوا۔ صہبا صاحب کی باتیں، ایسی باتیں تھیں کہ اگر ہم پلے باندھ لیتے تو شاید عبد العزیز خالد نمبر کی اشاعت ان کے سمجھائے ہوئے ذرائع سے ممکن ہو جاتی۔ مگر جب ہم دفتر سے باہر نکلے تو قدیر صاحب کہنے لگے: ”یہ ہیں صہبا صاحب اور یہ ہے ”افکار“۔ پھر اُن کے لیے ایک لقب نذر غائبانہ کے طور پر منتخب کیا اور فرمایا، ”انشاء اللہ عبد العزیز خالد نمبر“ شائع ہو کر رہے گا۔۔۔ مگر ایک سال تک جب یہ نمبر شائع نہ ہو سکا تو والد صاحب نے انھیں مشورہ دیا کہ اگر ممکن ہو تو نمبر کے بجائے بعض مختصر مضامین پر مشتمل ایک مقدمہ شائع کر دیا جائے۔ قدیر صاحب کو یہ رائے پسند آئی اور ۱۹۷۷ء میں انھوں نے دو صفحات پر مشتمل ایک ”مقدمہ عبد العزیز خالد نمبر“ شائع کر دیا۔ مگر اس کے بعد نمبر شائع ہونے کی نوبت نہ آسکی اور ان کی الماری میں بند کتابت شدہ مسودات کو قارئین کے بجائے دیکھنے کے لیے نا ممکن ہے۔ اگرچہ وہ باطن کی طبعی سچائی کے ساتھ بہت کھل دل کے مالک تھے، تاہم ایک جانب اُن کی شخصیت میں ایک گہرا پین بھی محسوس ہوتا جو بعض اوقات پُراسراریت کی تہ میں مزید گہرا ہو جاتا تھا۔ سوچتے، اٹھتے، بیٹھتے اور چلتے ہوئے بھی ان کے چہرے پر ایک خاص قسم کی سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ گو کہ کچھ دل چسپ مظاہر یا گفتگو سے یہ سنجیدگی کبھی کبھی کم تر ہو جاتی تھی، یہاں تک کہ لطائف و مضحکات کی مجلسی صورت احوال میں بھی وہ ایک خاص حد تک دھیمی سی مسکراہٹ سے اس قسم کی مجلسی فضا سے اپنی دل چسپی کا اظہار کر دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی کچھ ترنگ پیدا ہوتی تو کوئی لطیفہ بھی سنا دیتے مگر اس عمل میں بھی ان کے چہرے کی سنجیدگی رستہ رستہ ہتی تھی۔ میں نے اکثر محسوس کیا کہ وہ محظوظ کروانے اور محظوظ ہونے میں ایک حد فاصل رکھتے تھے۔

تاہم ان کی شخصیت کے ظاہری خدوخال میں جو ایک مطمئن اور اپنے حالات سے سمجھوتا کرنے والی شخصیت کے عکس نظر آتے تھے، اُن کے ساتھ بہت زیادہ وقت گزارنے والوں کے لیے کبھی کبھی ان کی اندرونی کیفیت کے آثار بھی ان کے چہرے پر بہت ہی ہلکے تاثر کے ساتھ اُبھرتے محسوس

روز میں نے ”فانوس“ کے پرانے شماروں میں چھپنے والی ان کی غزلوں کی جانب توجہ دلائی کہ انھیں مجموعی صورت میں لے آئیں تو انھوں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہ پرانی ہو چکی ہیں اور بہت سے پرچوں کا ریکارڈ بھی تلف ہو چکا ہے۔ اب تو کچھ نیا ہونا چاہیے۔۔۔ اگلے روز میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ان کی میز پر لکیر دار کاغذوں کا ایک دستہ پڑا ہے اور وہ کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا کہ قدیر صاحب کیا لکھا جا رہا ہے؟ کہنے لگے، ”یار خالد! دو اور ایک آدھی غزل ہوگئی ہے۔ اچھا سنو۔ میں نے غزلیں سنیں، دونوں غزلیں ہندی بحر میں ایک نیا ذائقہ لیے ہوئے تھیں۔ ان کے رنگ کلام سے بالکل مختلف۔ میں نے کہا کہ یہ آپ نے اس عمر میں کس قسم کی غزلیں کہنا شروع کر دیں۔ جو غزلیں آپ کو اب کہنا چاہئیں وہ آپ بہت پہلے کہہ چکے، اور یہ توجوانی کے جذبات ہیں، لگتا ہے ایک نوجوان قدیر شیدائی زندہ ہو رہا ہے۔ کہنے لگے: چھوڑو اس بات کو، تمہاری اس بات کا جواب میری تیسری آدھی غزل کے تیسرے شعر میں موجود ہے۔ شعر سنو:

رفتہ رفتہ آتے ہیں آداب محبت کرنے کے بات سلیقے سے کہنے میں ایک زمانہ لگتا ہے

واہ!۔۔۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور اسی دوران میں ان کے ایک عزیز کمرے میں داخل ہوئے اور ان سے کچھ ایسی باتیں کرنے لگے جو ظاہر ہے ان کے گھر کی باتیں تھیں۔ میں دیکھتا رہ گیا اور نگاہ دوسری جانب پھیر لی۔ قدیر صاحب ہوں ہاں کرتے رہے۔ ان کے جانے کے بعد قدیر صاحب کچھ لمحے خاموش رہے اور پھر مجھے متوجہ کرتے ہوئے کہا کہ ایک اور شعر سنو:

اہل محلہ تنگ آئے ہیں ”کس کس“ کی نادانی سے روز لڑائی ہو جاتی ہے، روز تماشا لگتا ہے
”کس کس“ کی جگہ یقیناً کوئی اور لفظ تھا، میں نے نحض وزن پورا کیا ہے۔ میں ان کا یہی البدیہہ شعر سن کر ہنس پڑا مگر وہ ایک گہرے سکوت میں چلے گئے اور مجھے بھی وہاں سے اٹھنے میں عافیت محسوس ہوئی۔

انھی ایام میں مجھے فیصل آباد جانا پڑا۔ تقریباً ایک ہفتے بعد جب میں ”فانوس“ کے دفتر حاضر ہوا تو بائیں جانب کے صوفے پر کوئی چوبیس پچیس برس کی ایک خاتون کو براجمان پایا۔ میں ذرا ٹھٹک گیا۔ قدیر صاحب حسب معمول دروازے کے سامنے والے صوفے پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ محلے کی خواتین کا آنا جانا تو وہاں لگا ہی رہتا تھا، خاص طور پر بھابھی صاحبہ سے ملنے کی خاطر اوپر جانے کے لیے دفتر کا کمرہ ہی راہ داری کے طور پر استعمال ہوتا تھا اور میں تقریباً ان کی رشتے دار اور محلے کی خواتین سبھی کو جانتا تھا۔ یہ خاتون میرے لیے اجنبی تھی اور پھر جس قسم کی چکا چوند اس خاتون میں پہلی ہی نظر میں دکھائی دی، وہی میرے ٹھٹکنے کا باعث تھا۔ دروازے میں مجھے کھڑا دیکھ کر قدیر صاحب نے کہا، آؤ، رُک کیوں گئے، ادھر آ کر بیٹھ جاؤ۔ بہر حال میں دائیں جانب ایک کرسی پر بیٹھ گیا تو قدیر صاحب نے میرا اُس سے تعارف کرواتے ہوئے بتایا کہ یہ شاعرہ ہیں اور پیشے کے اعتبار سے

میوہ ہسپتال میں نرس ہیں۔ اتنے میں اوپر سے بھابھی صاحبہ چائے طشتری میں سجائے نیچے آ گئیں۔ پھر مجھے دیکھتے ہی کہنے لگیں، خالد میں تمہارے لیے بھی چائے لے کر آتی ہوں۔ یہ کہہ کر پھر اوپر چلی گئیں اور میں خاموش سا بیٹھا رہا۔ کچھ دیر چھوٹی موٹی باتوں کے بعد وہ خاتون چائے پی کر چلی گئیں اور اتنے میں میری چائے بھی آگئی۔ باتوں باتوں میں قدیر صاحب نے بتایا کہ یہ خاتون چند روز پہلے اپنے کلام کا مسودہ لے کر آئی تھی کہ اسے چھاپ دیں۔ مسودہ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بہت سا کلام بے وزن ہے۔ پھر یہ روز آنا شروع ہوگئی اور چونکہ شائین کی سہیلی بن چکی ہے اس لیے میں نے بھی شرمندہ شرمندہ اس کے کلام کو دو تین دنوں میں وزن میں ڈھال دیا ہے، تو تم بھی دیکھ لو، یہ کہتے ہوئے انھوں نے تڑپائی پر پڑی ایک سفید رنگ فائل کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے فائل اٹھائی، ورق در ورق دیکھنے پر معلوم ہوا کہ قدیر صاحب نے خاصی کانٹ چھانٹ کر رکھی ہے۔ میں نے کہا، ”قدیر صاحب! لگتا ہے آج کل آپ کی طبیعت خاصی زوروں پر ہے اور یہ زور آپ نے خواتین پر صرف کرنا شروع کر دیا ہے۔“ میری بات سن کر ذرا سا مسکرائے اور کہا، ”مذاق چھوڑو، اسے تنقیدی نگاہ سے دیکھ بھی لو اور کمپوز بھی کر دو“۔ یوں باقی مشقت مجھے اٹھانی پڑی۔ قدیر صاحب کے حکم سے ایک فلیپ بھی لکھ دیا۔ کچھ روز بعد جب وہ خاتون کتاب چھپوا کر لے گئیں تو انھیں پھر کبھی قدیر صاحب کے دفتر یا بھابھی صاحبہ سے ملنے کو آتے نہیں دیکھا گیا اور نہ ہی ادبی حوالے سے اس کتاب کا کہیں کوئی ذکر سنا گیا۔ ظاہر ہے خاتون موصوفہ کو اپنے حلقہء اقارب میں صرف صاحبہ کتاب ہونا مقصود تھا، کوئی ادبی وابستگی ہرگز نہ تھی، البتہ قدیر صاحب کے ”حسن“ اصلاح کاری“ کی یہ کشش تھی کہ موصوفہ کی ایک غزل سرفے کا باعث ضرور بنی۔ واقعہ کچھ یوں ہے:

میرے نہایت عزیز دوست معروف شاعر و نقاد نوید صادق کو نیکیلا سے ایک ادبی پرچہ ”کاوش“ موصول ہوتا تھا۔ اس پرچے میں نیکیلا کے حلقہء ادب میں تنقید کے لیے پیش کی جانے والی نگارشات اور اجلاس کی روداد بھی شائع ہوتی تھی۔ ایک صفحے پر کسی نوجوان کے نام سے ایک غزل شائع ہوئی تھی۔ میں دیکھتے ہی چونک گیا اور پھر نوید صادق سے کہا کہ یہ تو فلاں مجموعے کی غزل ہے جو فلاں شاعرہ کے نام سے شائع ہو چکا ہے، چنانچہ نوید صادق نے مجموعے میں چھپنے والی غزل، فہرست اور سرورق کے عکس کے ساتھ پرچے کے مدیر کو ایک خط لکھا جس پر نہ صرف اس نوجوان کی سرزنش کی گئی بلکہ نیکیلا کے حلقہء ادب سے اُس کا نام بھی خارج کر دیا گیا۔

بعض اوقات قدیر صاحب کسی سبب سے ایک خاص لطف انگیز حالت اور خوش گوار موڈ میں ہوتے تو اپنی زندگی کے بعض دل چسپ واقعات سنانا شروع کر دیتے۔ خصوصاً نوجوانی کے بعض قصے۔ شروع کے دور میں انھوں نے ”فانوس“ کے ایک دو شمارے فلمی دنیا کے نام و رستاروں کے

جھونکے، اور موصوف نے پانچ چھ بند کا ایک سمدس کہہ ڈالا۔ اس وقت ایک بند یاد آ رہا ہے، (معذرت کے ساتھ) یہاں قارئین کی ضیافت طبع کے لیے نفس مضمون کے اعتبار سے شاید اس کا اندراج غیر متعلق نہ ہو اور ممکن ہے یادداشت میں کچھ لفظی تبدیلی بھی واقع ہوگئی ہو:

کچھ اس قدر شدید کہ دم سے نکل گیا سیلِ غبارِ جاں تھا، شکم سے نکل گیا
آیا تھا ہست میں تو عدم سے نکل گیا نکرا کے اُن کے خوانِ کرم سے نکل گیا

ایسا نکل گیا کہ نہ پھر آیا ”دست“ مسیں

اک شور رہ گیا تھا بلند اور پست مسیں

ایک دن بڑے مزے میں اور ایک خاص دُھن میں دکھائی دیے۔ اپنی ایک غزل کے شعرا ہستہ آہستہ اپنی بھاری اور خاص آواز میں گنگنا نے لگے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ واہ! آپ نے تو فریج کو مات کر دیا۔ ایک دم چپ ہوئے اور پھر کہنے لگے: ”کل تک میں نے تمہارا سارا شعری مجموعہ پڑھ لیا ہے۔ یہ عشق، ہجر، ویرانی، تنہائی؟ یہ کیا ہے۔ پورا مجموعہ اچھی حذب بات سے بھرا پڑا ہے“۔ میں نے کہا، جناب یہ شاعری ہے اور شاعری میں تو یہ سب کچھ آ ہی جاتا ہے۔ آپ کے ہاں بھی ایسے جذبات موجود ہیں، بس ذرا اندازِ بیاں کا فرق ہے۔ میری جانب قدرے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا اور کہا، اچھا یہ بتاؤ، کبھی تم نے عشق کیا ہے؟ میں نے کہا، یہ کرنے والی چیز تو نہیں اور اگر ایسا ہے تو پھر آپ سے کیا ہے کہ زندگی کا قیمتی حصہ آپ کے در پر گزار دیا۔ میری بات سن کر صرف اتنا کہا، ”آہا!“

ایک روز میں دوپہر کے وقت، سخت گرمی کا موسم تھا، تھکا ماندہ اُن کے دفتر پہنچا۔ وہ حسب معمول بیرونی دروازے کے بالکل سامنے صوفے پر موجود اور میں دروازے کے بائیں جانب دوسرے صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر نیم دراز حالت میں لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے کوٹھی کہ اُن کی بھاری بھر کم آواز گونجی، ”ادھر آؤ، بات سنو“۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ باہر کسی کو پکار رہے تھے۔ پھر ایک دس بارہ سال کا لڑکا کمرے کے اندر آ گیا۔ انہوں نے اپنی بائیں جانب پانی کے جگ اور گلاس کی طرف اشارہ کیا جو قریباً اُن سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ایک ترپانی پر موجود تھا۔ لڑکے سے کہا کہ مجھے گلاس میں پانی ڈال کر دو۔ لڑکے نے حکم کی تعمیل کی۔ پھر انہوں نے لڑکے کو حبانے کا اشارہ کیا۔ لڑکا دروازے تک گیا اور پھر پلٹ کر ایک نظر ترپانی کی جانب اور پھر قدیر صاحب کو دیکھنے لگا۔ قدیر صاحب نے گلاس سے ایک لمبا گھونٹ لیا اور پوچھا، ”کیا دیکھتے ہو؟“ لڑکا سنی اُن سنی کرتے باہر چلا گیا اور میری ہنسی نکل گئی۔ پوچھنے لگے، کیا بات ہے، ہنس کیوں رہے ہو؟“ میں نے کہا، آپ کو معلوم نہیں لڑکا کیا دیکھ رہا تھا۔ وہ اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ پانی والے جگ،

انٹرویوز سے بھی آراستہ کیے، تاہم فلمی دنیا سے اُن کا تعلق ایک خاص حد تک رہا اور انہوں نے اپنے ادیبانہ وقار اور شریفانہ کردار کو کبھی ٹھیس نہیں پہنچنے دی۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی خاندانی اور طبعی شرافت تھی۔ ان کا بیٹا مدثر قدیر، غالباً جب پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا، سکول سے آنے کے بعد کچھ وقت کے لیے اکثر وڈیو گیمز کھیلنے کے لیے چلا جاتا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں کہا کہ اس پر دھیان دیں، باہر کا ماحول کچھ اچھا نہیں۔ کہنے لگے، میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، میرا ایمان ہے کہ ہر قسم کا ماحول میسر ہونے کے باوجود میں نے اگر گم راہی کا راستہ اختیار نہیں کیا تو ان شاء اللہ میرا بیٹا بھی گم راہ نہیں ہوگا۔ اور الحمد للہ کہ بیٹے نے ٹیلی ویژن کے ایک دو ڈراموں میں بھی حصہ لیا، اور بھی کئی مواقع موجود تھے مگر باپ کی طبعی شرافت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچایا۔

بہت سی یادیں اور بہت سی باتیں ابھی باقی ہیں۔ ان کے ساتھ گزرے ہوئے زندگی کے بے شمار واقعات، کہاں تک لکھوں اور پھر اُن کی شاعری پر لکھنے کا قرض ہنوز باقی ہے جو شاید آئندہ کسی فرصت میں ممکن ہو۔ تاہم ان کی شخصیت کے بعض مختلف نوعیت کے گمراہ چسپ پہلوؤں کے حوالے سے دو تین واقعات پر اکتفا کرتا ہوں۔

ان کے خاص دوستوں میں بینک آفیسر اقبال شاہ، جن سے میری بھی بعض یادیں وابستہ ہیں، جب بینک سے جلد فارغ ہوتے، خصوصاً دوپہر کے وقت، تو ”فانوس“ کے دفتر ہی مسیں آ کر دم لیتے۔ گرمی کے دنوں میں ایک روز، ہم دوپہر کے کھانے میں مشغول تھے کہ وہ اپنے موٹر بائیک کو باہر کھڑا کرتے وقت تھکن سے نڈھال دکھائی دیے۔ قدیر صاحب نے حسب معمول مندا اوپر کر کے آواز لگائی، ”شاہ صاحب آئے ہیں، روٹیاں اور بھجیو“۔ اتنے میں وہ دعا سلام کر کے سیدھے صوفے پر آ کر ابھی بیٹھے ہی تھے کہ ایک دم اچھلے اور تیزی سے باہر جا کر اپنے موٹر بائیک کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔ پھر زوردار آواز سے مگر شکایت آمیز انداز میں پکارے، ”خدا کا خوف کریں قدیر صاحب! کوئی موقع تو خالی جانے دیا کریں۔“۔۔۔ قدیر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا، ”بھئی ہے، بھئی، ڈرامہ کرتا ہے۔“ پھر شاہ صاحب کو کہا، ”آ جاؤ، آ جاؤ، میں پنکھا تیز کر دیتا ہوں۔“ پنکھا تو تیز نہ ہوا، البتہ وہ تھنوں پر ہاتھ رکھے سیدھے صوفے پر آ کر نیم دراز ہو گئے۔ اس صورتِ احوال پر مجھے کھانے کی مزید حاجت نہ رہی مگر قدیر صاحب کا سلسلہ تناولِ حباری رہا۔۔۔ دراصل قدیر صاحب کو ”غبارِ شکم“ کی شکایت تھی اور ان کی بھاری بھر کم آواز کی طرح یہ ”غبارِ شکم“ بھی خاصا زور آور ہو جاتا تھا۔ بعد میں کئی دن اس کا چرچا رہا۔ انہوں نے ایک شاعر غزہ موسوم بہ خرم خراسانی کو دریافت کر رکھا تھا (بلکہ اُسے یہ نام بھی اُٹھی کا دیا ہوا تھا)، اُسے دعوت سن دی گئی، خود قدیر صاحب نے ممتاز احمد یوسفی کے حوالے سے ایک عنوان تجویز کیا: ”بادِ شکم کے

گلاس اور آپ میں کتنا فاصلہ ہے۔ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اوپر کی جانب زور دار آواز میں پکارا۔ ”چائے۔۔ ایک میرے لیے، ایک خالد کے لیے۔۔“

اُن کے ملنے والوں کو اگرچہ ان کی طبیعت میں ایک تساہل محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود کچھ کرنے کے بجائے غیبی مدد کے خواہاں تھے لیکن ایسا ہرگز نہیں۔ ممکن ہے یہ ان کی تساہل پسندی ہو مگر میرے خیال میں اپنے دیگر گوں حالات اور محدود وسائل کے ساتھ اُن کا ایک سمجھوتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا نے جو کچھ دے رکھا ہے، وہی ان کی گزر بسر کے لیے کافی ہے، اور اس کے لیے کسی قسم کی کوشش بیکار ہے۔ بہر حال اسے ان کی تساہل پسندی کیسے یا تو گل پسندی، انہوں نے اپنے مالی وسائل کو بڑھانے کے لیے کوئی ناجائز یا جائز کوشش بھی نہیں کی۔ انہیں معمول کی گزر بسر کے لیے جو کچھ درکار ہوتا، وہ مل جاتا تھا۔ اُن کے اس رویے نے آہستہ آہستہ ”فانوس“ کی اشاعتوں میں بھی تعطل پیدا کر دیا اور پھر اُن کی زندگی کے آخری تین چار برسوں میں ”فانوس“ شائع ہونے ہی سے محروم ہو گیا۔

نئی صدی کا سفر ابھی شروع ہوا تھا کہ ایک دن مجھے کہنے لگے، میرا خیال ہے اس صدی میں تو میرا مجموعہ کلام چھپ ہی جانا چاہیے۔ میں نے کہا، کیوں نہیں، کمپوز کروائیں اور چھاپ دیں۔ چنانچہ بڑی سرعت سے مجموعے کا کام شروع ہوا اور چند روز میں جب کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی مکمل ہو گئی تو میرے کہنے پر کمپوز ڈمسودہ ڈاکٹر خواجہ محمد جرز کر یا صاحب کو دیا گیا۔ انہوں نے کمال مہربانی سے فلیپ لکھ دیا، اور بعد ازاں میں نے محترم شہزاد احمد صاحب سے گزارش کی۔ انہوں نے حامی تو بھر لی مگر کئی دن گزرنے پر بھی مسودہ ان کے حوالے نہ کیا جا سکا۔ آخر ایک روز میں نے شہزاد صاحب کو فون کیا۔ وہ ریڈیو اسٹیشن سے واپس گھر جانے والے تھے مگر اُن کا لطف اس قدر بے پایاں کہ میری گزارش پر وہ ”فانوس“ کے دفتر تشریف لے آئے۔ آتے ہی کہنے لگے کہ یہاں تو میں پہلے بھی کئی بار آچکا ہوں۔ پھر قدیر صاحب سے اتنے کھل مل گئے کہ امرت سرکاڈ کر چل نکلا۔ قدیر صاحب امرت سرکو ”امبرسر“ کہا کرتے تھے۔ شہزاد صاحب نے ہنس کر کہا کہ ”تسلیں واقعی امبرسری او، امرت سردا رہن والا ای مرت سرنوں امبرسر کہہ سکتا اے۔“ (آپ واقعی امبرسری ہیں، امرت سرکار ہنسنے والا ہی امرت سرکو امبرسر کہہ سکتا ہے) پھر ایک دو دن بعد انہوں نے اپنی رائے لکھ کر قدیر صاحب کے حوالے کر دی اور اس میں بھی امرت سرکا بطور خاص ذکر کیا۔۔۔ مگر افسوس کہ مجموعہ اُن کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔

اپنی وفات سے چند سال پہلے انہوں نے مختلف تاریخی کتابوں کا سلسلہ بھی ادارہ فانوس کے تحت شروع کیا تھا۔ دو تین کتابیں چھپیں۔ خود بھی ایک کتاب ”دیوتاؤں کی حکومت“ کے نام سے لکھ کر شائع کی۔ کچھ نہ کچھ آمدنی ہوئی مگر پبلشنگ کے اس کام میں جو قوت کا درکار تھی، وہ اب دم توڑتی جا

رہی تھی۔ مزید یہ کہ ایک روز بھابھی صاحبہ کی طبیعت اچانک بگڑ گئی۔ علاج کے دوران میں مستامی ڈاکٹر کی ذرا سی بے احتیاطی سے بخار کے لیے لگا یا گیا آنکیشن مزید تکلیف کا باعث بن گیا اور آخر کار کامیو ہسپتال میں فوری طبی امداد کے باوجود جان بر نہ ہو سکیں۔ اس وقت میرے عزیز دوست اشرف سلیم صاحب بھی وہاں موجود تھے اور بذریعہ فون اُنھی سے انتقال کی خبر ملی۔ ان اللہ وانا الیہ راجعون۔ عمر بھر کی ہم رکاب، دکھ سکھ میں برابر کی شریک اس باحوصلہ، خدمت شعار اور وفا پرست خاتون کے یوں بچھڑ جانے کے بعد ایک سال ہی مشکل سے گزرا تھا کہ ۱۲ مئی ۲۰۰۳ء کو رضاعہ الہی کا پروانہ اُن کے حق میں بھی آ گیا۔ یوں میرا اُس زمانے کا واحد ادبی مرکز، جو قدیر صاحب کی اقامت گاہ بھی تھی اور دفتر بھی، میری اُن سے پچیس چھیس برسوں کی رفاقت کی ان گنت یادوں کو چھوڑ کر یک دم اجڑ گیا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے مدثر قدیر اور بیٹی عطیہ قدیر کو جب پرسہ دینے کے لیے جاتا تو وہی تقسیم سے قبل کی دیواریں، جن کے درمیان کبھی بہت معروف ادبی شخصیات مرکز اور صاحب مرکز کی کشش میں تشریف فرما رہتی تھیں، مجھے اپنی جانب افسردگی سے دیکھتی محسوس ہوتیں اور یوں لگتا، جیسے زبان حال سے کہہ رہی ہوں:

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش و نگار طاق نساں ہو گئیں

میری ایک کتاب ”اردو شاعرات کی نعتیہ شاعری“ (سوانح و تنقید) انہوں نے کئی برسوں سے چھاپنے کے لیے مجھ سے لے رکھی تھی۔ اس وعدے کو وہ اپنی زندگی میں یوں نبھا گئے کہ بستر مرگ پر اپنے بیٹے کو نصیحت کی، میرے دنیا سے جانے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کرنا ہے کہ خالد سلیم کی کتاب شائع کر کے اُس تک پہنچاؤ اور بیٹے نے، اُن کی وفات کو ابھی ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا، باپ کی وصیت کی پاس داری میں یہ کتاب نہ صرف چھاپ دی بلکہ اپنی لاڈلی بہن عطیہ کے ساتھ گھر آ کر مجھے کتاب پیش کر کے حیران کر دیا۔۔۔ خوشنایاب اور خوشنایاب بیٹی۔۔۔ اللہ تعالیٰ قدیر صاحب کی حسنا کو قبول اور کوتاہیوں سے درگزر فرما کر انہیں اپنے جوار رحمت میں رکھے۔۔۔ آمین!۔۔ اور یہ خاک سار، جو اپنی عمر کے اس حصے میں اس احساس سے دوچار ہے:

مباش بے خبر از درس بے شبانی عمر

کہ ہر نفس ورتے قریں کتاب می ریزد

اس کی دعاؤں کی قبولیت کے ساتھ یہ رو و مجتہد خطاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے اپنی عطاؤں سے سرخ زور فرمائے۔۔۔ آمین!



حمد

بدل گیا ہے مزاجِ دوراں کرم کی ٹھنڈی ہوا چلی ہے
 مری فغاں لب پ آتے آتے صدائے تلبیر بن گئی ہے
 تو موسموں کو نکھار بجختے، حنزاں کو رنگِ بہار بجختے
 تو باب کھولے بصیرتوں کے، نگاہ کو اعتبار بجختے
 تراہی پر تو جھلک رہا ہے سحر کی پرنور ساعتوں میں
 تیرے ہی فیض و کرم کے باعث تجلیاں ہیں میری شبوں میں
 ترے ہی ذکرِ جمیل میں ہیں یہ چاند سورج، یہ کہکشاں بھی
 یہ چہچہاتے ہوئے پرندے، زمین بھی اور آسماں بھی
 دعائیں سنتا ہے بے کسوں کی کہ تو سمیع و بصیر بھی ہے
 دلوں کے سب بھید جانتا ہے کہ تو علیم و خبیر بھی ہے
 سوا لیوں کو نہال کر دے، ترے خزانے میں کیا کمی ہے
 نعیم ہے تو، کریم ہے تو، رحیم و رحمان ہے، عنسی ہے

نگارشاتِ قدیر شیدائی

مہکار

قدیر شیدائی

مرتبہ

محمد شکور طفیل

رفتہ رفتہ آتے ہیں آدابِ محبت کرنے کے
 بات سلیقے سے کہنے میں ایک زمانہ لگتا ہے



ریشم سے جسم چاند سے چہرے دھواں ہوئے
دل بچھ گیا تو کتنے حسین بے نشاں ہوئے
تاراج کر گیا وہ مرے دل کی سلطنت!
کیا کیا نہ ولولے تھے کہ بے خانماں ہوئے
جیسے کسی چٹان سے چشمہ ابل پڑے
آنکھوں سے آج اس طرح آنسو رواں ہوئے
پہلے ہمیں کہاں بھتا شعور خود آگئی
لٹنے لگے تو واقف سود و زیاں ہوئے
ہم نے تو دشمنوں کو بھی چپا ہا ہے ٹوٹ کر
یادش بخیر! آپ تو پھر حبان حبان ہوئے
لہجہ بنا، سزاج میں آئی شگفتگی
دیکھا انھیں تو لفظ غزل کے رواں ہوئے
اس شوخ کا وجود بھی آفت ہے اے تقدیر
ڈھلنے لگا شباب تو فتنے جواں ہوئے



حسن بکتا ہے، کہیں عشق کی رسوائی ہے
کن اصولوں پہ تری انجمن آرائی ہے
لٹ گئی بزم خیالوں کی، بڑی دیر ہوئی
کوئی جلوہ ہے نہ اب کوئی تمنا شائی ہے
شب تاریک کے پردے سے نکل نورِ سحر
اک زمانہ ترے جلووں کا تمنائی ہے
چپ اگر بسٹھوں تو جینے نہیں دیتی دنیا
شعر کہنا بھی غم یار کی رسوائی ہے
رات نے تیرگی مانگی ہے تری زلفوں سے
چاند نے تیرے تبسم سے ضیا پائی ہے
یہ جو دیوانہ سا گزرا ہے گلی سے تیسری
لوگ کہتے ہیں ترے حسن کا شیدائی ہے
شوخیوں کرتی ہے پھولوں سے گلستاں میں قدیر
مست و بے خود ہے ہوا، کس کو یہ چھو آئی ہے
ہائے اس شوخ کا اندازِ تکلم بھی تقدیر
بارہا جس کو بھلانے کی تم کھائی ہے



پھوٹی ہے خاکِ داں سے نئی سوچ کی کرن
ذروں میں دیکھتا ہوں ستاروں کا بانگین
جو اس نے کہہ دیا، وہ مجھے ماننا پڑا
جادو تھا اس کے پاس محبت بھرا سخن
کروٹ بدل بدل کے گزاری تمام رات
خوشبوے انتظار میں جلتا رہا بدن
صورت حسین نہیں ہے تو ہرگز نہ ہو ملول
چہرے نکھار دیتا ہے سیرت کا بانگین
موسم کے ساتھ وہ بھی بدلتے چلے گئے
سنجیدگی سے ڈھانپ لیا چلبلا بدن
کانٹوں میں پارہا ہوں گلوں کی لطافتیں
خود آگئی کے زخم کا مسرہم ہے حسنِ ظن
عظمت کی جستجو ہے تو خدمتِ شعار ہو
ہے مال و زر عزیز تو موقع شناس بن
بادِ صبا تو ہاتھ نہ آئی مسگر تقدیر
کھلتا چلا گیا مسری امید کا چمن



نیند میں خوابِ عجب آتے ہیں
آنکھ کھلتی ہے تو ڈر جاتے ہیں
آرزو اس کے ملن کی تو بے
لوگ دیوانے ہوئے جباتے ہیں
رازان کا ہے ہمارے دل میں
بات کرتے ہوئے گھبراتے ہیں
چاندنی رات سے خوف آتا ہے
قالے اس میں بھی لٹ جاتے ہیں
ہائے کیا زحمت دیا ہے تو نے
دیکھنے زہرہ جس میں آتے ہیں
باز آ جاؤ بری باتوں سے
عشق جو کرتے ہیں پچھتاتے ہیں
سامنا جب بھی کہیں ہوتا ہے
وہ نظر اپنی جھکا جاتے ہیں
کتنے نادان ہیں ہم دل والے
چوٹ ہر بار نئی کھاتے ہیں
کبھی انسان بدلتا ہے تقدیر
کبھی حالات بدل جاتے ہیں



وہ کیا جانے پیار کی رسمیں جس کا علم کتابی ہے
شہر صنم میں جنس و فنا کی دل والو! نایابی ہے
ناگن زلفیں، دل کش چہرہ، ہونٹوں پر شادابی ہے
جسم ہے اس کا جلتا صندل، رنگت نیم گلابی ہے
یوں لگتا ہے جیسے اس کی رات سفر میں گزری ہو
چہرے پر آثار تھکن کے، آنکھوں میں بے خوابی ہے
دھرتی مہکی جاتی ہے اک فصل جواں کی خوشبو سے
جھوم رہے ہیں پھول اور کلیاں، ہر جانب شادابی ہے
عشق کے دریا میں جو ڈوبا، وہ سردار زمانے کا
چاہ زرخداں خوب ہے لیکن اس میں نری غرقابی ہے
پیش نظر منظر ہے سہانا، دیکھ رہا ہوں شیدائی
بہتا دریا، نیلا امبر، تاروں میں شب تابانی ہے



اس کی گلی کا قصد نہ کرنا، دیوانے ہو جاؤ گے
تہائی سے خوف آئے گا، رونق سے گھبراؤ گے
بتھر جیسے لوگ ملیں گے، دل شیشہ ہے، ٹوٹے گا
سوچ سمجھ کر پاؤں اٹھانا اور نہ ٹھوکر کھاؤ گے
کیوں ہشیار بنے پھرتے ہو، میٹھے بول میں حبادو ہے
جب کوئی تعریف کرے گا، خود بے خود ہو جاؤ گے
رت مستانی، پھول کھلے ہیں، خوشبو ہے، تہائی ہے
بادل رستہ دیکھ رہا ہے، جانے تم کب آؤ گے
کون تمھارا جادو توڑے، کس میں اتنی ہمت ہے
تم نے مجھے مدہوش کیا ہے، تم ہی ہوش میں لاؤ گے
اس کا حسن مصور کرنا کھیل نہیں ہے شیدائی
جو اس کی آواز بنے، وہ رنگ کہاں سے لاؤ گے



ہر چند میرے ساتھ وہ کچھ دور تک گئے
پھر مسکرا کے بولے، مرے پاؤں تھک گئے
سرخ لبوں سپان کے شفق زار بن گئی
بارحیاسے چہرہ و عارض دمک گئے
پھر بے خودی میں ڈوب گیا حسن کائنات
چھیڑے جو اس کے بال، اندھیرے مہک گئے
نکلے وہ بے حجاب جو گھر سے تو اس کے بعد
ایسی ہوا چلی کہ ماسٹر بھٹک گئے
مل جل کے آؤ، اپنا گلستاں سنوار لیں
تصویرِ نو بہار کے غنچے چنک گئے
آسائشوں میں اپنی، کچھ اُس کی رضا بھی تھی
گزری کچھ اس طرح سے کہ ارماں سسک گئے
تھا کیف گیسوؤں کی ہوا میں عجب تدریر
ناداں تھے، جو سرد میں آ کر بہک گئے



اور بھی لوگ یہاں تھے پہلے
تذکرے تیرے کہاں تھے پہلے
مقبرے جن کے ہیں ویرانوں میں
رونقِ بزمِ جہاں تھے پہلے
تیری دنیا سے مری دنیا تک
فاصلے اتنے کہاں تھے پہلے
ہر کوئی دیکھ کے سمجھتا تھا
جانے کس سمت رواں تھے پہلے
اب سرے سامنے آ بیٹھے ہیں
وہ جو پردے میں نہاں تھے پہلے
یہ جو دیوانے نظر آتے ہیں
عاشقِ گلِ بدناں تھے پہلے
اب خموشی کی حکایت میں تدریر
نغمہ اہلِ زباں تھے پہلے



قصہ تشنہ لبان یاد نہیں
جام کھنکے تھے کہاں، یاد نہیں
کس نے چھیڑا تھا وفا کا نغمہ
کون تھا رقص کنناں، یاد نہیں
وہ جنھیں ہم سے بڑی الفت تھی
کیوں بنے دشمن جاں، یاد نہیں
شکل پہ چپانی ہوئی لگتی ہے
میں نے دیکھا تھا کہاں، یاد نہیں
دوست کہیے کہ اسے دشمن جاں
تھا کوئی دل میں نہاں، یاد نہیں
دل سا سلطان تھا کس کے بس میں
مجلسِ کشورِ حباں! یاد نہیں
دل کے شاداب گلستاں پہ قدیر
کب گری برق تپاں، یاد نہیں



مرے درد بھرے گیتوں میں نہاں اس پائل کی جھنکا بھی ہے
کانٹوں کی چھین کے ساتھ چمن میں پھولوں کی مہر کا بھی ہے
ان مہکے مہکے ہونٹوں کے غنچوں کا تبسم کہتا ہے
تم پیار کی باتیں مت پوچھو، یہ آگ بھی ہے گلزار بھی ہے
آسان نہیں ہیں دوری کے دشوار مسرا حاصل طے کرنا
اب تیری میری راہوں میں اک دنیا کی دیوار بھی ہے
انصاف کے پردے میں اب تک سر کٹتے ہیں مظلوموں کے
محفل میں تری انسان ابھی محکوم بھی ہے، لاحپا بھی ہے
یہ اپنی اپنی سوچ میں ہیں اور اپنی اپنی قسمت ہے
اس شوخ کی دل کش باتوں میں اقرار بھی ہے، انکار بھی ہے
جب یاد تھاری آتی ہے، زخموں میں حلاوت پاتا ہوں
جو درد دیا ہے تم نے مجھے، وہ درد مسرا غم خوار بھی ہے
اب تیرے شہر کی گلیوں میں دکھ سہتا ہے، چپ رہتا ہے
تیرا یہ قدیر شیدائی، اس دور کا جو ن کار بھی ہے



درد بن کر جو دوا دیتے ہیں
ہم انھیں دل سے دُعا دیتے ہیں
یوں وہ لہراتے ہیں دامن اپنا
جیسے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
بات کرنا نہ کسی سے کوئی
لوگ افسانہ بنا دیتے ہیں
تیسری دنیا کے بدلتے تیور
اک زمانے کا پتہ دیتے ہیں
صاحبِ حسن نہیں چھپ سکتا
اس کے انداز بت دیتے ہیں
کیسی ہوتی ہیں وفا کی راہیں
کوئی پوچھے تو بت دیتے ہیں
چاہیے دل میں لگن منزل کی
راستہ لوگ دکھا دیتے ہیں
ہم نے دیکھا ہے سوالی بن کر
وہ طلب سے بھی سوا دیتے ہیں
حالِ دل کون کہے ان سے قدیر
ہم تو اشعار سنا دیتے ہیں



دلوں میں جن کے لگی ہو، وہی سمجھتے ہیں
کہ لوگ میرے لبوں پر ہنسی سمجھتے ہیں
رہ حیات کی تاریکیوں سے کیا خورشہ
ترے خیال کو ہم روشنی سمجھتے ہیں
ہمارے دم سے تو فتنہ ہے بزم کی رونق
ستم ہے لوگ ہمیں اجسبی سمجھتے ہیں
مرے پیام میں شامل ہے جن کا حسن خیال
وہ اب بھی میری وفا میں کمی سمجھتے ہیں
تمہارے غم سے عبارت ہے زندگی اپنی
تمہارے غم کو تو ہم زندگی سمجھتے ہیں
قدیر ربطِ محبت اسی سے قائم ہے
جہاں والے جسے برہمی سمجھتے ہیں



سلام اے مرے صبر و ستار کی دنیا
بڑی حسین ہے کسی انتظار کی دنیا
ہر ایک سانس معطر ہے آرزوؤں سے
مہک رہی ہے دل پر بہار کی دنیا
مجھے فریب محبت نہ دو، خدا کے لیے
لٹی ہوئی ہے مرے اعتبار کی دنیا
کہاں گیا وہ تراذوقِ خواب نیم شبی
کدھر گئی وہ مرے اختیار کی دنیا
خدا کی دین ہے زاہد، جسے بھی مل جائے
ریاضِ خلد سے افضل ہے پیار کی دنیا
بنارہی ہے کئی راستے فضیلت کے
مرے لیے مرے پروردگار کی دنیا
نہ گیسوؤں میں کشش ہے، نہ رخ پہ بارحیا
بدل رہی ہے ادا حسن یار کی دنیا
جہانِ حمد و ثنا میں ہوں میں تیر مسگر
دل و نظر کا تقاضا ہے یار کی دنیا



یوں ہی تو از دحام نہ خلق خدا کا ہتا
اس شہر کی گھٹن میں وہ جھونکا ہوا کا ہتا
آندھی اڑا کے لے گئی امن و سکون کا روپ
بکھرا ہوا گھر و ندا کسی فناختہ کا ہتا
رد کر رہا ہتا مجلسِ شوریٰ کا فیصلہ
قاضی جو شہر کا تھا، وہ عنانِ بلا کا ہتا
مستی میں آ کے لالہ و گل جھومنے لگے
نقشِ قدم پہ یار کے چلن ہوا کا ہتا
سانسوں میں خواہشوں کی تھی خوشبو رچی ہوئی
اور ان سے گفتگو میں مسزہ انتہا کا ہتا
قربت میں اس کی تھا حدِ فاصل کا اہتمام
میں جس کی جستجو میں مسافرِ حلا کا ہتا
پتھر کے رہ گئے تھے کئی لوگ راہ میں
جادو سا اک عجیب کسی کی صدا کا ہتا



یہ قرض بہاراں بھی ادا کرتے رہیں گے
ہم ذکر ترا بادِ صبا کرتے رہیں گے
گلشن میں سنا کر لب و رخسار کے نغمے
ہر پھول کو ہم شعلہ نوا کرتے رہیں گے
تم اپنی جہناؤں سپہ شیمان نہ ہونا
ہم اہلِ مروت ہیں، وفا کرتے رہیں گے
آباد ہیں جب تک یہ ترے شہر کی گلیاں
ہم کوئی فقیرانہ صدا کرتے رہیں گے
یہ ہارے ہوئے بازی تہیر کے مہرے
تقدیر کے شاطر سے گلہ کرتے رہیں گے
پھر آ گیا ظالم نئے انداز بدل کر
سوچا تھا کہ اب یاد خدا کرتے رہیں گے
واعظ نہ سنا جنت و دوزخ کے فسانے
رحمت کے طلب گار خطا کرتے رہیں گے
سجدہ بھی ضروری ہے تیر اپنے خدا کا
اشعار میں ہم حمد و ثنا کرتے رہیں گے



راستی اختیار کر لیجے
زندگی خوش گوار کر لیجے
نوجوانی کی کچھ خطاؤں کو
بندگی میں شمار کر لیجے
جل رہے ہیں دیے امیدوں کے
جشن شام بہار کر لیجے
عمر بھر کون سا تھو دیتا ہے
مانے، اعتبار کر لیجے
ہر نفس پھونکیے دم عیسیٰ
نقش کو شاہکار کر لیجے
آپ کا کچھ نہیں بگڑتا حضور
دو گھڑی ہم سے پیار کر لیجے
چھیڑ کر ذکر بگل زخوں کا تدریر
دل کو باغ و بہار کر لیجے



کیسے تجھے سکھاؤں سلیقہ حباب کا
تیری نظر میں اور ہے مقصد شباب کا
اک آنہ ہے بات مسری ترے سامنے
شاعر نہیں ہوں صرف میں حسن و شباب کا
کر غور کس طرح تجھے رسوائیاں ملیں
کیوں کر ہدف بنا تو جہان حنراب کا
عریانی بدن تری عظمت پہ داغ ہے
تو دہریں امیں ہے حیا کے نصاب کا
پھرتا ہوں در بہ در میں جنوں کی تلاش میں
ہر باب پڑھ چکا ہوں خرد کی کتاب کا
آنکھوں کے سامنے ہیں بھیانک حقیقتیں
جو دکھتا ہوں، کاش یہ منظر ہو خواب کا
جا کر چمن میں سیکھیے اسلوب زندگی
کانٹے بھی ساتھ رکھتا ہے بوٹا گلاب کا
ہرگز گلہ نہیں ترے افکار سے مجھے
سارا فوڑ ہے یہ منرگی نصاب کا
کیسے کرے تمیز حرام و حلال کی
فتائل نہیں رہا جو گناہ و ثواب کا
دشمن کی بے بسی بھی نہ دیکھی گئی تدریر
دل میں خیال آ گیا روز حساب کا



ان سے میں نے رازداری کا صلہ چاہا نہ ہتا
معتبر ٹھہروں گا محفل میں، کبھی سوچا نہ ہتا
یک بہ یک بیدار مجھ کو کر گئی بانگِ سحر
نیند کا غلبہ تھا لیکن میں ابھی سویا نہ ہتا
سورۃ الحمد نے توڑا طلسم آزری
میں بتوں میں گھر گیا تھا، راستہ ملت نہ ہتا
دیکھتے ہی دیکھتے سب داغ عصیاں ڈھل گئے
ٹوٹ کر ابر کرم ایسے کبھی برسائ نہ ہتا
راستے میں علم و عرفاں کا خزانہ مسل گیا
دیکھنے نکلے تھے میلہ، جیب میں دھیلا نہ ہتا
ایک حیرت ناک منظر تھا نظر کے سامنے
کھل گئیں آنکھیں تو دیکھا، جو کبھی دیکھا نہ تھا
دیکھ کر جس کو گساں انسان کا ہوتا تدریر
وقت کی زنبیل میں چہرہ کوئی ایسا نہ ہتا



شعلہ سا بھڑکا ہے دل میں، اک بجبلی سی ہسرائی ہے
 برسات کی بھیسگی راتوں میں جب یاد کسی کی آئی ہے
 میں نے بھی اٹھایا ہے صدمہ اک البیلی سی چاہت کا
 میں نے بھی غزل کہنے کے لیے اک چوٹ ریلی کھائی ہے
 وہ گورا گوراسا مکھڑا اک پھول دکھائی دیتا ہے
 ان نیلی نیلی آنکھوں کی پھیلوں میں بڑی گہرائی ہے
 دنیا کے حسین بت خانے میں ان گیسوؤں والوں سے ہم نے
 کچھ پیار کی رمزیں سیکھی ہیں، کچھ درد کی دولت پائی ہے
 ہے باعث تسکین دل کے لیے الزام کسی کی چاہت کا
 کیا بیٹھے بیٹھے طعنے ہیں، کیا پیار بھری رسوائی ہے
 اے شوخ نظر کچھ تو ہی بنا، تو نے تو اسے دیکھا ہوگا
 کہتے ہیں تقدیر شیدائی اک آوارہ ہر جانی ہے



مجھ کو خبر کے واسطے کوہ ندا دیا گیا
 دیکھنا میرے عہد کے بچوں کو کیا دیا گیا
 شوخی نو بہار نے اس کی گلی کا رخ کیا
 موسم انتظار کو میرا پتا دیا گیا
 دونوں کا ایک مرتبہ، دونوں کا اک مقام ہے
 اس کو جنت کی نحو، مجھے ذوق وفا دیا گیا
 منصب اقتدار پر نشہ اقتدار دیکھ!
 ایک ذرا سی بات پر روم جلا دیا گیا
 دھیان میں کیا وہ آگیا، جسم تمام جلا اٹھا
 اُس کا خیال بھی مجھے شعلہ ندا دیا گیا
 ہونٹ ہمارے سی دیے سوزن راز سے تقدیر
 پردہ جو درمیان ہتا، اس کو ہٹا دیا گیا



مخند و میرت کو دست نگر کر دیا گیا
 مسند نشیں کو حناک بسر کر دیا گیا
 محفل میں اس کی آنکھ چھپکن غضب ہوا
 رخ جام کا ادھر سے ادھر کر دیا گیا
 ازبر نہ کر کے کوئی آئین دوستی
 ہر ضابطے کو زیر و زبر کر دیا گیا
 تنظیم و اتحاد و یقین خواب ہو گئے
 پیمان دوست صرف نظر کر دیا گیا
 ہیں خوب شاعروں کی یہ جدت طرازیں
 جو عیب مستند ہتا، ہنر کر دیا گیا
 میں لکھ رہا تھا مہر و محبت کی داستان
 میرے قلم کو واقف زکر کر دیا گیا
 مانگی دعا تو اور ہی عفتدہ کھلا تقدیر
 قطرہ صدف بغیر گہر کر دیا گیا



ہر کوئی مبتلا ہے مندریب نظر ملا
 شہر طلب میں جو بھی ملا، در ب در ملا
 مجھ سے کلام کر، تری ہستی نکھار دوں
 میں واقف بہار چمن ہوں، نظر ملا
 کیا خوب ہے زمین محبت کے باغ کی
 موسم گزر گیا تو وفا کا ثمر ملا
 کرتا ہے بے نقاب ہر اک پردہ دار کو
 ذوق مشاہدہ بھی مجھے فتنہ گر ملا
 رسوائیاں چھپا گیا شہرت کا پیر ہن
 تجھ سے جدا ہوا تو کمال ہنر ملا
 ناداں کی دوستی کا بھروسہ نہیں تقدیر
 دل کا معاملہ ہے، نظر سوچ کر ملا



آنکھ میں بے پناہ لالی تھی
 شکل اس کی بڑی جلالی تھی
 وہ کسی اور کا مقدر ہت
 آس ہم نے عنلط لگالی تھی
 مثل سقراط لگ رہا ہتا وہ
 ہاتھ میں چپائے کی پیالی تھی
 آنکھ میں ہتا نشہ جوانی کا
 رُخ پہ شرم و حیا کی لالی تھی
 اور کچھ بھی نہ ہتا کمال اپنا
 تیری صورت غزل میں ڈھالی تھی
 نقش دُھندلا گئے ہیں ماضی کے
 جو بھی تصویر تھی، خیالی تھی
 واقع من و عن بیاں کر کے
 حُسن کی آبرو بچا لی تھی
 رہ گیا ہے قدیر اپنا بھرم
 جیب ہی کٹ گئی جو حالی تھی



بہلائیے سنہ شوخی گفتار سے مجھے
 کچھ تو ثبوت دیجیے کردار سے مجھے
 پتھر ہوں میں جسین تکبر کے واسطے
 گھائل نہ کر عنرور کی تلوار سے مجھے
 آواز گھٹ گئی ہے گرانی کے بوجھ سے
 کیا کیا شکایتیں نہیں سرکار سے مجھے
 پھیلا ہے اک ہر اس نگاہوں کے سامنے
 آتا ہے خوف کو چہ و بازار سے مجھے
 فکر و نظر سے بنتا ہے آفاقیت کارنگ
 ہرگز گلہ نہیں کسی فن نکار سے مجھے
 جن کے لیے محال ہے تزمین بزم نو
 وہ دیکھتے ہیں چشم شرر بار سے مجھے
 پتھر تھا میں قدیر مگر وہ حسین بھی
 پگھلا گیا ہے پیار کے افترار سے مجھے



تنہائی کا دوزخ مجھے جنت سی لگے ہے
 یہ وہم ہے میرا کہ گساں، سوچ رہا ہوں
 جب واقف اسرار وفا ہوتے ہیں عشاق
 محسوس یہ ہوتا ہے، وہ گزرے ہیں ادھر سے
 تیرے لیے بے تاب ہوں، کراس کا تدارک
 یہ بھی تو کوئی حسن کا انداز ہے شاید
 ٹھہرا نہیں کوئی ترے جلووں کے معتابل
 یہ ناز، یہ انداز، یہ بیباک تبسم
 آتا ہے تو پچھل سی مچا جاتا ہے دل میں
 آئے ہے تری یاد تو راحت سی لگے ہے
 کیوں تیرا تصور بھی عبادت سی لگے ہے
 پھر زہر کے پیالے میں بھی لذت سی لگے ہے
 اک حشر سا برپا ہے، قیامت سی لگے ہے
 دل میرا پریشان ہے، وحشت سی لگے ہے
 اس شوخ کی آنکھوں میں سخاوت سی لگے ہے
 دیوانگی شوق میں ہمت سی لگے ہے
 پھر آج انھیں میری ضرورت سی لگے ہے
 ہر ایک ادا اس کی شرارت سی لگے ہے
 جو خواب نگاہوں میں بسا رکھے ہیں اس نے
 دیکھوں تو قدیر ان میں حقیقت سی لگے ہے



اس بزم میں کسی کو کسی کی خبر نہیں
 سو زسخن نہ ڈھونڈ کتابوں کے ڈھیر میں
 ہے رشکِ خلد تیرے تبسم کی اک کرن
 بس مسکرا کے ڈال دے ہاتھیں گلے میں تو
 آئینہ بن کے دیکھ، تجھے آگہی ملے
 محنت سے پھول کھلتے ہیں قسمت کی شاخ پر
 دل جل رہے ہیں اور کوئی چہارہ گر نہیں
 یہ دین ہے خدا کی، کمال وہنہ نہیں
 دنیا بھی ہے حسین مگر اس قدر نہیں
 میرا مذاق، طالبِ لعل و گہر نہیں
 جو کچھ بھی سامنے ہے، فریب نظر نہیں
 ہمت خدا سے مانگ، اگر مال و زر نہیں

کرا اجتاب شر سے، تری خمیر ہو قدیر
 یہ شام وہ ہے، جس کا مقدر سحر نہیں



تعریف کیا کرے وہ شبِ ماہِ تاب کی
دیکھی جھلک ہو جس نے تمہارے شباب کی
دریا میں ڈوب جاتی ہیں معصوم سونہیاں
کیسے گھڑے بناتی ہے مٹی چناب کی
عادت سی بن گئی ہے تجس کی دوستو
پڑھنے کے بعد گنتا ہوں سطریں کتاب کی
چہرے پر امتزاج ہے رنگوں کا اس طرح
جیسے دھنک بناتی ہے صورتِ رباب کی
لہجے میں بس گیا ہے تراطرزِ گفتگو
دیتے ہیں لوگ داد مرے انتخاب کی
ملنے نہ آئے گئے ہوں کہیں آج وہ متدیر
کمرے میں ہے رچی ہوئی خوشبو گلاب کی



بھٹک رہے ہیں نئے لوگ روشنی کے لیے
کوئی پیامِ محبت! نئی صدی کے لیے
اس انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں مدت سے
وہ آہی جائے گا تجھ دید دوستی کے لیے
تری خوشی کے لیے جی رہے ہیں دیوانے
وگر نہ لاکھ بہانے تھے خودکشی کے لیے
نگارِ حسانہ ہستی میں آدمی کا وجود
کہیں غموں کے لیے ہے، کہیں خوشی کے لیے
بغیرِ صدق یقین کچھ نہ ہاتھ آئے گا
یہ آگہی بھی ضروری ہے بندگی کے لیے
متدیر مشقِ ستم خوے دوستاں ٹھہری
کسے وکسیل کریں آج منصفی کے لیے

ظالم ترا اندازِ ستم سب سے جدا ہے
اک شخص کھڑا کب سے تجھے دیکھ رہا ہے
رستے کی خبر کوئی نہ منزل کا پتا ہے
ہر بات اسے کہہ دینے کا اندازِ نیا ہے
سرسبز درختوں کو ڈھواں چاٹ رہا ہے

بے چین سا رکھتی ہے قدیر اس کی تمننا
شاید یہ پریشانی، محبت کا صلہ ہے



یوں میری چاہتوں کا صلہ دے گیا مجھے
انسان کی طلب تھی، خدا دے گیا مجھے
دیکھیں جو اس نے میری قدامت پسندیاں
انداز سوچنے کا نیا دے گیا مجھے
پہلے تو اس نے دیکھا متانت سے میری سہمت
پھر اپنے گیسوؤں کی ہوا دے گیا مجھے
چہرے پہ اس کے اپنی جفا کا نہ ہتا ملال
جاتے ہوئے وہ درسِ وفادے گیا مجھے
فطرت کا محبِ زہ ہتا وہ مہر کا ہوا بدن
صندل کے جنگلوں کا پتا دے گیا مجھے
جو رستم بھی اس کا لطافت سے کم نہ ہتا
ہر بار اک سرور نیا دے گیا مجھے
مقبول ہو گیا میں زمانے کی آنکھ میں
کیا خوب ہتا کہ اپنی ادا دے گیا مجھے
آنکھوں میں اپنی اشکِ جدائی لیے ہوئے
بچھڑا تو زندگی کی دعا دے گیا مجھے
منصف نہیں ہے کوئی، بتاؤں کسے متدیر
کیا لے گیا ہے مجھ سے، وہ کیا دے گیا مجھے



یہ کیسا رنگِ بہاراں مرے چہن کا ہے
نہیں ہے جس تو احساس کیوں گھٹن کا ہے
گیا وہ دور کہ چرچا ہتا مسرودانا کا
اب اہتمامِ نالیش وجودِ زن کا ہے
خطیبِ شہر کے لب پر بھی ہے جزاک اللہ
کچھ ایسا طرزِ سخا طب ترے بدن کا ہے
بلا کا حسنِ لطافت ہے اس کے چہرے پر
وہ پھول ہے تو خدا جانے کس چہن کا ہے
کہاں سے آئی ہے، ہسکی ہوئی نسیم بہار
خمار اس میں ترے حسنِ پر فتن کا ہے
ہلال اور ستارہ ہے عظمتوں کا نشان
بہت حسین ہے جو پرچم مرے وطن کا ہے
بڑے غرور سے تکتے ہیں آئینہ وہ متدیر
عتابِ ڈھلتی جوانی پہ حسنِ ظن کا ہے



ہرگز برا نہ مان حسینوں کی بات کا
ان کی ہر اک ”نہیں“ میں ہے پہلو ثبات کا
دیکھو جسے بھی، اس کی نگاہیں ہیں عرش پر
ہر شوخ مدعی ہے تری کائنات کا
میرے قریب بیٹھا ادب سے، یہ شرط ہے
نکتہ تجھے بتاؤں میں ذات و صفات کا
دیکھو اگر نوشتہٴ تقدیر غور سے
لکھا ہوا ملے گا تمہیں اپنے ہات کا
بے وجہ کب ملا ہے مجھے حسنِ حاشی
رکھتا ہوں میں شعور حیات و مہمت کا
دکھ درد بانٹ، خدمت انساں شعار کر
اس کے سوا نہیں کوئی مقصد حیات کا
اٹھتی ہے اعطش کی صدادل سے اے قدیر
پہرے میں ظالموں کے بے دریا فرات کا

خوشا اس شوخ پر آیا شباب آہستہ آہستہ
کھلا اس کا بدن مثل گلاب آہستہ آہستہ
ادائیں شوخیاں، نکھیلیاں، مستی سے پُر غمزے
پڑھا اس نے جوانی کا نصاب آہستہ آہستہ
تعب ہے ابھی تک خواب غفلت میں پڑے ہو تم
کہ سر پر آ رہا ہے آفتاب آہستہ آہستہ
بڑی مشکل سے سنبھلا ہوں ابھی دنیا کی ٹھوکر سے
کہیں میں ہونہ جاؤں پھر خراب آہستہ آہستہ
نہیں ممکن تھا یکدم تاب لانا اس کے جلووں کی
اٹھایا اس نے چہرے سے نقاب آہستہ آہستہ
حلاوت خیز دھن سن کر دل و جان جھوم جاتے ہیں
معنی چھیڑ پھر تارِ رباب آہستہ آہستہ
عجب بے چارگی پھیلی ہوئی ہے حلق کے اندر
کہ زیر پرورش ہے انقلاب آہستہ آہستہ
قدیر اس کی گلی میں دل سے کوشش تم کیے جاؤ
ہوئے ہیں لوگ اکثر کامیاب آہستہ آہستہ



(مظلوم مسلمانوں کی نذر)
توپوں کی گرج ہے، کہیں چیخوں کی صدا ہے
بوسنیا و کشمیر میں اک حشر بپا ہے
تاریکی شب چہر گیا کس کا یہ نوحہ
کس بیٹی کی آواز ہے، گھر کس کا حبلہ ہے
آزادی کے متوالے ڈرے ہیں، نہ ڈریں گے
کشمیر کے ہر گھر پہلو سے یہ لکھا ہے
بارود کی بو پھیلی ہے ہر سرد و سمن میں
شاداب فضاؤں میں عجب زہر گھلا ہے
وادی میں مہا بد کی اذان گونج رہی ہے
سویا ہوا کشمیری جواں جاگ اٹھا ہے
ہردور میں پیرو ہیں حسینؑ ابن علیؑ کے
ہردور میں اک معرکہ کرب و بلا ہے
الحاق سے کم کچھ ہمیں منظور نہیں ہے
کشمیر کے ہر پیرو جواں کی یہ صدا ہے



محبت میں وہ رسوائی ہوئی ہے
کہ اک دنیا تماشا شائی ہوئی ہے
طبیعت راہ پر آئی ہوئی ہے
کہ ہم نے چوٹی سی کھائی ہوئی ہے
تمنائیں ہماری بھی جواں ہیں
وہ دوشیزہ بھی گدرائی ہوئی ہے
تماشا ہے ترا مجھ سے بچھڑنا
کہ خلقت پوچھنے آئی ہوئی ہے
سہانی رات تھی اس کی کہانی
جواب تک ذہن پر چھائی ہوئی ہے
نہیں اس کا تعلق پھر بھی مجھ سے
نہ جانے کیوں وہ شرمائی ہوئی ہے
نہ پوچھو داستانِ محفل شب
مری آنکھوں میں نیند آئی ہوئی ہے
قدیر مضطرب شعروں میں تو نے
یہ کیسی آگ بھڑکائی ہوئی ہے



اوروں کو ذوقِ انجمن آرائی دے گیا
مجھ سے ملا تو گوشہ تہائی دے گیا
کانٹے کو پھول، پھول کو رعنائی دے گیا
جس سے بھی وہ ملا، اسے یکتائی دے گیا
آیا ہت تیسری شوخی گفتار کا خیال
میری غزل کو حسن پذیرائی دے گیا
کھلتے ہوئے گلاب کا منظر عجیب ہتا
دیدہ وروں کی سوچ میں گہرائی دے گیا
عہد شباب، موسم گل، چودھویں کا چاند
تیرا جمال ان کو بھی زیبائی دے گیا
میں بھولنے لگا ہت تیرے گھر کا راستہ
نجم سحر کہاں مجھے دکھلائی دے گیا
اک بے وفا سے پیار کی خوشبو نہ چھپ سکی
دودن کا ساتھ شہر میں رسوائی دے گیا
سورج کی روشنی بھی اندھیرا تھی اے قدیر
ذوق خود آگہی مجھے بینائی دے گیا



یہ آرزو ہے، ترے بام و در سجاؤں میں
فلک سے چاند ستارے بھی توڑاؤں میں
زباں پہ آنہیں سکتا تمہارے بارے میں
جو سوچتا ہوں، اسے کس طرح بتاؤں میں
سناؤں کوئی کہانی، کسی حسینہ کی
اسی بہانے تجھے رات بھر جگاؤں میں
غم حیات کی بے چینیوں سے گھبرا کر
سکون سے تری آنکھوں میں ڈوب جاؤں میں
شب وصال کی سب شوخیاں سمیٹے ہوئے
سحر کے وقت تجھے خواب سے جگاؤں میں
ہجوم تشنہ نگاہاں کا اک تماشا لگے
ترے جمال سے پردہ اگر اٹھاؤں میں
یہ پھول چہرے، یہ یکیاں، یہ کاروبارِ چمن
ہیں انقلاب کی زد میں، کسے بچاؤں میں
چھپا رہا ہوں محبت کے غم زمانے سے
فریب خوردہ سہی، پھر بھی مسکراؤں میں
حضور یار اشاروں سے بات بستتی ہے
مجھے یہ حکم ہے، ہرگز نہ لب ہلاؤں میں
ہر ایک شخص یہاں مست اپنی دھن میں ہے
جو دل پہ بیت رہی ہے، کسے بتاؤں میں
جو بس چلے کبھی بازار سے سنگزروں قدیر
کہ مفلسی میں کئی خواہشیں دباؤں میں



ہر ایک بات ہی اس شوخ کا فسانہ لگے
کہ جس کو ڈھونڈنا چاہیں تو اک زمانہ لگے
ٹھہر گیا ہے نظر میں ترے جمال کا رنگ
ہو جس طرح کا بھی موسم مجھے سہانا لگے
کسے کسے کوئی قسمت کا ہاتھ دکھلائے
مزاج گردشِ دوران کا کچھ پستان لگے
ہے بات عام سی، پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے
حسین بہت ہیں مگر کوئی آپ سانس لگے
کہاں سے سیکھا ہے تیرے بدن نے یہ جاو
گریز پا بھی رہے اور گریز پانس لگے
نکل رہی ہیں محبت میں سرد سرد آہیں
خدا کرے مرے دشمن کو یہ ہوا سن لگے
فریب کھا کے بھی ہم مسکرا کے ملتے ہیں
قدیر شکوہ کناں آدمی بھلا سن لگے



کعبہ بھی یہیں ہے تو مدینہ بھی یہیں ہے
کیا اپنی زمیں ہم سر افلاک نہیں ہے؟
برگشتہ سی، اس کا یہ اندازِ حسیں ہے
کیا جانئے! کیا سوچ کے وہ چیں پہ جنیں ہے
جودل پہ گزرتی ہے، اسے کیسے بتاؤں
رکھتا ہوں زباں، جرأت اظہار نہیں ہے
میلہ ہے ستاروں کا سر کوئے تمنا
ہے چاند سا چہرہ تو کوئی زہرہ جس میں ہے
ہے عشق کے رستے میں کڑی دھوپ کا پہرہ
تپتا ہوا صحرا ہے، کہیں چھاؤں نہیں ہے
ہر آن کھلے جاتے ہیں اسرارِ محبت
پہلو میں مراد، ترے رازوں کا امیں ہے
ہے نیمِ رضا وہ سرے اندازِ طلب پر
آنکھوں میں ہے اقرار، لبوں پر جو نہیں، ہے
ڈرے کہ بدل جائے نہ اب طرزِ بہاراں
اس عہد کے پھولوں میں کوئی باس نہیں ہے
یہ کونسی منزل ہے کہ منصف نہیں ملتا
مظلوم صدا دیتا ہے، انصاف کہیں ہے؟
ٹھہراؤ ہے لفظوں میں، سخن میں ہے حلاوت
اس شوخ کا اندازِ بیاں سب سے حسیں ہے
ہے اس کے خیالوں میں قدیر اپنی یہ حالت
دل جانبِ قبلہ ہے، نظر اور کہیں ہے



کچھ ان کی طبیعت چنچل ہے کچھ مستی ہے پروائی میں
ڈر ہے نہ میں وحشی ہو جاؤں اس موسم کی رعنائی میں
وہ بال بکھیر کے چہرے پر مصروف ہیں حسن آرائی میں
ہم ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں بیتاب کھڑے انگنائی میں
ساون کے مہینے میں اکثر یادوں کی دھنک تڑپاتی ہے
اک دردِ مسلسل کی لہریں اٹھتی ہیں ترے سودائی میں
بندے بھی نہیں چھیڑے ہم نے چاہت کی چھینا چھٹی میں
چوڑی بھی سلامت رکھی ہے اس شوخ کی ہاتھ پائی میں
وہ جا بھی چکے مدت گزری اب کوئی نہیں جو آئے گا
ماضی کے جھروکے میں بیٹھو اور شعر کہو تہائی میں
ارباب ہنر کی نظروں میں مقبول ہمیشہ رہتے ہیں
ہو بس تمھارے ہونٹوں کا جن گیتوں کی شہنائی میں



راہوں میں سرِ شام بھٹکنا نہیں اچھا
ہو جاتے ہیں بدنام، بھٹکنا نہیں اچھا
سنجھلے گی ستم سے کبھی من زور جوانی
کر دو یہ مرے نام، بھٹکنا نہیں اچھا
بدروحمیں تعاقب میں ہیں ہر ایک حسیں کے
اے میرے دل آرام، بھٹکنا نہیں اچھا
تصویر خیالوں میں بسالیتے ہیں اس کی
کرتے ہیں یہی کام، بھٹکنا نہیں اچھا
غم اس کی جدائی کا بہل جانے گا آحسر
آجائے گا آرام، بھٹکنا نہیں اچھا
کندن جو ہن! آگ میں اپنی وہ جلا ہے
اے میرے مسِ خام بھٹکنا نہیں اچھا
عشاق کا میلہ ہے قدیر اس کی گلی میں
لگ جائے گا الزام، بھٹکنا نہیں اچھا



چشمہ نہ ان لبوں میں ہو آبِ حیات کا
پھولوں کی پتیوں میں ہے دریاِ نبات کا
اک مہِ حسین بھول گیا خوں دلبری
دو چپار روز کر کے ستم التفات کا
سورج سے کب چھٹی ہے مرے گھر کی روشنی
اب تک نظر کے سامنے منظر ہے رات کا
طوفانِ زیست جانے کہاں لے گیا اسے
میں جس میں گم ہو اوہ سمندرِ رختِ ذات کا
خاموش بیٹھ رہنا شرافت سے ہت بعید
دینا پڑا جواب مجھے التفات کا
معیوب ہے گزرنا حدِ اعتدال سے
چسکا برا نہیں ہے حسینوں کی بات کا
ہر زاویے پہ بکھری ہے فطرت کی دکاشی
تیرا بدن لگے ہے خیاں سوات کا
جانے وہ کس خیال سے شرمائے و قدیر
دے کر مجھے شعورِ جمالِ حیات کا



اب محفل محفل ہر لب پر اس شوخ نظر کی باتیں ہیں
یا زلف و رخ کے قصے ہیں یا شام و سحر کی باتیں ہیں

یہ دور قیامت ہے شاید دنیا سے مسروت روٹھ گئی
انسان کی وقعت کچھ بھی نہیں، سب مال و زر کی باتیں ہیں

احساس میں خوشبو بھر دی ہے جس شوخ نے اپنی چاہت کی
اشعار نہیں لب پر میرے اس فتنہ گر کی باتیں ہیں

دنیا کو بتانے کا حاصل خفگی کے سوا کچھ اور نہیں
بہتر ہے کہ اپنے گھر میں رہیں جو اپنے گھر کی باتیں ہیں

صبح بہاراں، شام طلب، یہ پھول سے چہرے جان طرب
سب حسن ظن کے قصے ہیں، سب حسن نظر کی باتیں ہیں

ماضی کے سمندر میں پنہاں ہے ایک بسزیرہ خوابوں کا
اب میرے خیالوں کی رونق اس خواب نگر کی باتیں ہیں



میٹھی میٹھی باتیں اس کی سندر سپنا لگتا ہے
عشوہ، غمزہ اور ادائیں اک جادو سا لگتا ہے

جھیل کنول سی ان آنکھوں میں پیاس کا صحر لگتا ہے
نادانوں کو حسن و وفا کا بہتا دریا لگتا ہے

رفتہ رفتہ آتے ہیں آداب محبت کرنے کے
بات سلیقے سے کہنے میں ایک زمانہ لگتا ہے

گلشن گلشن سرو و سمن میں تیرے فتد کی باتیں ہیں
نگری نگری گل بدنوں میں تیرا چرچا لگتا ہے

بادِ صبا مد ہوش ہوئی ہے چھو کے تمھاری زلفوں کو
حد نظر تک سارے عالم مہر کا لگتا ہے

رونق بن کر آجاتا ہے وہ میری تنہائی میں
اس کا یہ پرکیف تصور کتنا اچھا لگتا ہے

آگے جا کر حسن و عشق کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں
عقل کی حد تک ان دونوں کا ایک ہی رستا لگتا ہے

دیکھ کے اس کے بکھرے گیسو سوچ رہا ہوں شیدائی
الہیلی دوشیزاؤں کو کیا کیا اچھا لگتا ہے



جہاں نیند آئی، وہیں سو گئے
فقیروں کا کیا ہے، کہیں سو گئے

جو ناکام اٹھتے تو ہنستا جہاں
ترے در پہ رکھ کر جسیں سو گئے

رہے، خواب اپنے پریشاں سبھی
خیالوں میں زہرہ جسیں سو گئے

انہیں کیا خبر بزم ہستی کی کچھ
جو رستے میں جاگے نہیں، سو گئے

یہ کہتی ہے پھیلی ہوئی روشنی
مکان جاگتے ہیں، مکین سو گئے

سجائی نہ محفل کوئی رات بھر
پکارا تمھیں اور وہیں سو گئے

ہیں سنسان لگیاں، پریشان دل
الہی کہاں ہم نشیں سو گئے



تیرے اوصاف سے منور ہوں
کس بلندی کے آسماں پر ہوں
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں زہرہ جیوں
جانے کس شوخ کا متدرہ ہوں
بات اب تک سمجھ نہیں آئی
آسنہ ہوں کہ آسنہ گرہوں
اپنی تنہائیوں سے پوچھ کبھی
میں تری آرزو کا محور ہوں
اختلاف نظر کی بات سنہ کر
میں ترے آسنے کا جوہر ہوں
آتش گل یہ کہہ رہی ہے مجھے
میں تو اک آگ کا سمندر ہوں
خواہشیں بے شمار ہیں اے قدیر
کتنی محرومیوں کا دفتر ہوں



دشمن ہے محبت کی دنیا اس رستے میں سوگھا تیں ہیں
تڑپاتی ہیں تنہائی میں برسات کی ایسی راتیں ہیں
اک خواب حسین دیکھا تھا کبھی تعبیر بتائیں کیا اس کی
کچھ زخم کھلے ہی سینے میں کچھ اشکوں کی برساتیں ہیں
بیٹے ہوئے لحوں کی یادیں بیتاب و پریشاں رکھتی ہیں
ہوتوں پہ مرے نغموں کی جگہ اب آہوں کی سوغائیں ہیں
نگری نگری، قریرہ، چرچپا ہے تمہارے جلووں کا
ارباب نظر کی محفل میں کب دلوں والوں کی باتیں ہیں
اے جان! رسیلے ہونٹوں سے اک شام ہمیں بھی مل جائے
سائے میں تمہاری زلفوں کے پر کیف مہکتی راتیں ہیں
تاریکی شب کے پردے میں جگنو سے چسکنے لگتے ہیں
آتی ہیں تری پائل کی صدا، یہ خواب نگر کی باتیں ہیں
یہ جھیلیں، دریا، کوہ و دمن یہ شام و سحر کی رنگینی
سب تیری ادا کے مظہر ہیں، سب تیرے ہنر کی باتیں ہیں



پھر کسی چشم غزالیں کا چپلن یاد آیا
تیز سانسون میں بسا مُٹھکِ حستن یاد آیا
سرد موسم کی ٹھٹھرتی ہوئی تنہائی میں
گرم ملبوس کی صورت وہ سخن یاد آیا
پھول مہکے تو تری زلف کی خوشبو آئی
چپاند چکا تو ترا ٹھہرا بدن یاد آیا
جس کی خاطر ہوئے بدنام زمانے بھر میں
دشت تنہائی میں وہ غنچہ دہن یاد آیا
رات پھر تیرے شبستاں کے خیالوں میں کٹی
مست و بیخود ترا اندازِ بدن یاد آیا
ساتھ سکھیوں کے ترا جانا سنورنے کے لیے
ملنے آ جانا مجھے بن کے دہن، یاد آیا
کتنے آرام سے کتنے تھے شب و روز قدیر
دشتِ غربت میں جو بھٹکے تو وطن یاد آیا



آیا ترا خیال تو منظر سنور گئے
توس قزح کے رنگ اُفتخ پر بکھر گئے
گیسو کھلے تو بادِ صبا تک مہک گئی
ان کی ہنسی سے رنگ گلوں کے بکھر گئے
کچھ اپنی شخصیت متنازع تھی شہر میں
کچھ دلربا سے لوگ بھی بدنام کر گئے
بیٹے دنوں کی یاد میں کب تک رہیں اسیر
اچھے تھے یا برے تھے، مری حبال گزر گئے
بھونچال سارے شہر کی نیندیں اُڑا گیا
جھٹکا لگا تو پچھئی کردار ڈر گئے
اپنے عزیز بھی مجھے کمزور حبان کر
جو تہمتیں تھیں ان پہ، مسرے نام کر گئے
پیاسی رہی زمین محبت کی اے قدیر
بادل اُمد کے آئے تھے لسیکن گزر گئے



سال گزشتہ، سات نومبر، دن معلوم نہیں وہ کیا ہتا
ساتھ جئیں گے، ساتھ میں گے یاد کرو، یہ تم نے کہا ہتا
جانے تیری مست نظر نے مجھ پر کیا حب دو پھونکا ہتا
ہوش اڑے جاتے تھے میرے مجھ سے پھر سنبھلا نہ گیا تھا
آنکھ کھلی تو حد نظر تک دشت ہتا پھیلا تہائی کا
شہر نگاراں خواب تھا جیسے، ناز وادابھی اک دھوکا ہتا
ایسا اک طوفان اٹھا تھا پاؤں اکھاڑیئے تھے جس نے
پیار کا دعویٰ کرنے والا چار قدم کب ساتھ چلا ہتا
سورج، چنڈا، پھول اور جگنو، دیکھتے تم کو ہی آتے تھے
اس بستی کا حسن تمھی تھے، باقی تو سب کچھ دھوکا ہتا
اس کے کرم کا چرچا سن کر شاید ہم سے بھول ہوئی ہے
روشن روشن آنکھوں والا چاند سا چہرہ مانگ لیا ہتا؟
جو ہونا تھا، ہو کے رہا ہے، اب کیسا رونا شیدائی
وہ روٹھا تو پھر کیا ہوگا تم نے پہلے کب سوچا ہتا



رنگ ہے، روپ ہے، جوانی ہے
چپا سو دورِ شادمانی ہے
آج کی شام کیا سہانی ہے
وہ ہیں اور اپنی میزبانی ہے
ہم کہاں التفات کے قابل
حسن والوں کی مہربانی ہے
دل کی دنیا عجیب ہے جس میں
آرزوؤں کی حکمرانی ہے
سگدل نرم خوبھی ہوتے ہیں
دوستو! آگ میں بھی پانی ہے
وہ مری بات بھی نہیں سنتے
اس قدر زعم حکمرانی ہے
کس سے مانگیں ترے سوا یارب
کون تیرا جہاں میں ثانی ہے
تیلیوں کی نظر ہے پھولوں پر
آرزوئے وفا پرانی ہے
یار سے کیا گلہ کریں اے تدیر
رنج و غم پیار میں نشانی ہے



وہ جھوٹا ہتا یا سچا ہتا
اپنا اپنا طرزِ وفا ہتا
میں اس کو ناداں سمجھا ہتا
اس نے مجھے انجان کہا ہتا
اس نے جو کا غم پھینکا ہتا
ایک بجے شب کو لکھا ہتا
میں مستی میں جھوم گیا ہتا
جس دم دروازہ کھٹکا ہتا
رات کے لب پر حنا موٹی تھی
شہر میں الو بول رہا ہتا
آنکھوں میں تھے خواب سہانے
باتوں میں اک جادو سا ہتا
اس سے آگے کچھ مست پوچھو
میں پیاسا ہتا، وہ دریا ہتا
اس کے پیار کا ساون رت میں
بادل بھی کھل کر برسا ہتا
وہ بھی بچھڑ کر رویا ہوگا
میں بھی تو شب بھر رویا ہتا



تم کتنے بے باک حسین تھے
میں کتنا بھولا بھالا ہتا
میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا
اللہ ہی جانے بھید وہ کیا ہتا
اس کے سرے ارمان کا جھولا
ایک زمانہ دیکھ رہا ہتا
وصل بھی اس کا خوب ہے لیکن
ہجر کا اک اپنا ہی مزا ہتا
سوچ رہا ہوں خواب ہتا کیسا
آنکھ کھلی تو میں تنہا ہتا



تنہائی میں آہٹ سے اس شوخ کا ڈر حبانہ
 اظہارِ محبت کا ہم نے یہ ہنر حبانہ
 گرنے کے بہانے سے تاریک سے زینے میں
 لگ کر مرے سینے سے بیتاب سا کر حبانہ
 آپس میں گلے ملتے ہوں شام و سحر جیسے
 یوں اس رخ روشن پر زلفوں کا بکھر حبانہ
 دیوانہ بنا رکھنا اپنے لب لعلیں کا
 انکار کے لہجے میں استمرار سا کر حبانہ
 برسات کے موسم میں یوں آتی ہے یاد اس کی
 جیسے گل تازہ کی خوشبو کا بکھر حبانہ
 ظالم کی جراحت کا انداز انوکھا ہت
 اک زخ، کا کھل جانا اک زخم کا بھر حبانہ
 ہوتے ہیں محبت میں آداب تکلم کے
 آداب تکلم کی حد سے نہ گزر حبانہ
 تنہائی کے لمحوں میں سوچا ہے تدبیر اکثر
 کس سمت چلے آئے ہم نے تھا کدھر حبانہ



مرحومہ شاہین کوثر کے لیے
 اپنی وفا کے پھول کھلا کر چسلی گئی
 وہ میرا گلستان سجا کر چسلی گئی
 دیوانہ وار آئی تھی میرے جہان میں
 حسن و جمال اپنا دکھا کر چسلی گئی
 کچھ روز میرے ساتھ بہاروں کی رت رہی
 نقش و نگار اپنے بٹھا کر چسلی گئی
 جس کی ہنسی سے وجد میں آتی تھی کائنات
 نغمے وہ زندگی کے سنا کر چسلی گئی
 ایسے بھی چھوڑتا ہے کوئی نمگ راستہ؟
 میں ہنس رہا ہتا، مجھ کو زلا کر چسلی گئی
 دو چار پل کے واسطے مثل صبا تدبیر
 آئی مرے متربیب تو آ کر چسلی گئی



نادان جوانی کو اکثر مخلوق خدا سمجھاتی ہے
 جب ٹھوکر لگتی ہے کوئی پھر بات سمجھ میں آتی ہے
 اس رنگ بدلتی دنیا کے دھوکے میں کہیں مت آ جانا
 تعبیر نہیں ملتی اس کی دنیا جو خواب دکھاتی ہے
 اس ہر جانی کے ہنٹولوں پر جادو ہے مسخر کرنے کا
 اس فتنہ گر کی باتوں سے خوشبوئے محبت آتی ہے
 آنکھوں میں سما یا رہتا، اپنوں سے بچھڑنے کا موسم
 انسان چلا جاتا ہے مگر یادوں کی دھنک رہ جاتی ہے
 وحشت سی برسنے لگتی ہے دیوارِ درد سے شام ڈھلے
 گھر سونا سونا لگتا ہے نیند آنکھوں سے اڑ جاتی ہے
 بے چین سے رکھتے ہیں مجھ کو منظر گزری برساتوں کے
 کمرے میں لگی تصویر تری ہر آن مجھے تڑپاتی ہے

قدیر شیدائی

منتخب اداریات ”فانوس“

(۱)

ادب قومی کردار کا عکس بھی ہوتا ہے اور معیار بھی۔ اسی آئینے میں ہم اپنے خواب و خیال کے نقوش ابھرتے دیکھتے ہیں اور آنے والی نسلیں انھی نقوش کو قبول کرتی ہیں، یوں ایک قوم پرترتی کی راہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی شعر و ادب کی اہمیت مسلم تھی، خصوصاً شاعری کی عظمت کی بنا پر مکہ کی سنگلاخ وادی میں بسنے والے غیر متمدن انسان بھی خود کو عرب کہلانے پر فخر محسوس کرتے تھے اور اپنے سوا ہر کسی کو غمی یعنی گونگا کہتے تھے۔ میدان جنگ میں رجزیہ اشعار پڑھتے تھے اور ہاری ہوئی فوج کے پست حوصلہ کو از سر نو تازہ کیا جاتا تھا۔ محفل عیش و عشرت میں اس شخص کا داخلہ ممنوع تھا جو قواعد شاعری سے نابلد ہوتا تھا۔ پھر دین اسلام پھیلا۔ اس نے جہاں حیات انسانی کے ہر راز کو مکمل طور پر انسانوں پر عیاں کیا تھا، مکمل طور پر ضابطہ حیات دیا تھا، انسانی زندگی گزارنے کے بہتر اور مکمل قوانین عطا کیے تھے، وہیں شعر و ادب کو بھی ایک نیا رنگ بخشا۔ اب ادب نے حدیث، فقہ، تفسیر کی صورت اختیار کر لی۔ عہد عباسیہ میں علم و ادب نے جو ترقی کی، وہ علوم اسلامیہ کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ اس حکومت نے شعر و ادب کی جس قدر سرپرستی کی ہے کسی اور زمانے میں نہیں ہوئی۔

حکمران تو میں اپنے اختیارات کے بل بوتے پر وہ کام قوموں سے نہیں لے سکتیں جو ایک ادیب اپنی آتش نو اتحریروں اور شاعر شعلہ بیاں اپنے اشعار سے لے سکتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا ہر صفحہ شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں سے مزین ہے۔ سر سید احمد خاں، حالی، شبلی اور خصوصاً اقبال کی شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ اگر وہ لوگ اس قدر ہمارے ذہنوں کو بیدار نہ کرتے، مردہ احساس کو زندہ قویٰ میں نہ بدل دیتے، ہماری منجمد سوچ کو شعلہ نو اتحریروں سے پگھلا نہ دیتے تو ہم آج پیارے پاکستان کی آزاد فضاؤں میں سانس نہ لے رہے ہوتے۔ سر سید احمد خاں کا تحسین کی جانب رغبت دلانا، حالی کی جدید اور اصلاحی نظمیں، شبلی کی بزرگوں کے کارہائے نمایاں سے معمور تحریریں انھی کے بل بوتے پر ہماری صد سالہ غلامی کی زنجیریں کٹیں۔ ہماری قوت ایمانی متحرک ہو گئی جس نے ہماری جامد زندگی میں جذبہ جدوجہد کو داخل کر دیا اور اسی جذبے کی تصویر پاکستان ہے۔

ان سب نے اپنے اپنے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ قابل فخر ہیں، لیکن اقبال

کی شاعری مسلمانوں کے لیے تازیا نہ ثابت ہوئی۔ بنی نوع انسان کو روحانی انقلاب کا پیغام دینے کی جو واضح مثال کلام اقبال میں ملتی ہے دنیا کے کسی اور شاعر میں نظر نہیں آتی۔ اقبال مسلمانوں کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ پستی سے بلندی کی طرف راغب ہونے کے لیے ماڈیت کو روحانیت میں جذب کر دیں۔ غرض اقبال کے، زندگی سے بھرپور، پیغام نے پاک و ہند کے مسلمانوں خصوصاً دنیا بھر کے مسلمانوں کو گہری نیند سے جگا کر ترقی کی جانب راغب کیا۔ ادیب و شاعر اپنی تحریروں اور کلام سے ایک چنگاری کو شعلے کی صورت دے سکتے ہیں۔ کردار و اخلاق کو بلند یوں پر لے جاسکتے ہیں کیوں کہ یہ سب کچھ ذہنی بیداری کا کرشمہ ہوتا ہے جس سے ہم میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ چالیسی صورت میں حکومتوں کی پالیسیوں، سیاسی ریشہ دوانیوں کے بجائے قوم کو ادیب کے میٹھے بولوں اور احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لیے شاعرانہ اختصار و ایجاز کی ضرورت ہوتی ہے۔

شعر و ادب سے قوم کو عظیم قیادت میسر آسکتی ہے،..... (ادیب و شاعر) عظمت کردار کی لذتوں سے آشنا کر سکتا ہے کیوں کہ قوموں کے عروج و زوال میں اصل اہمیت کردار کو حاصل ہے اور شعر و ادب بھی اعلیٰ و بلند کردار کی تخلیق میں پیش پیش ہے۔ (جلد: ۲۶، شمارہ: ۱۲)

(۲)

آج کا ظریف الطبع نقاد اس بات پر مصر ہے کہ نئی نسل بیدار مغز (بالغ نظر) اور پڑھی لکھی ہے۔ اس کا ادبی مزاج تکنیک، ہیئت، اسلوب اور جمالیاتی نظریات جدید دور کی سائنسی، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے پیدا کردہ ہیں، لہذا اسے اپنے انداز سے پروان چڑھنے کا حق حاصل ہے۔ چوں کہ ادب ہمیشہ سے معاشرے میں رواں دواں تحریکات سے متاثر ہوتا آیا ہے اور نئی نسل اپنے زور و قوت سے معاشرے کی ہنگامہ خیزیوں کی عکاسی کرتی رہی ہے، اس لیے اسے جدت خیال اور جدت فکر کی روشن مثال سمجھنا چاہیے۔ ہم نے مانا کہ سر و کا بوٹا خوب صورت اور دل کش ہوتا ہے لیکن اگر اس کی تراش خراش نہ کی جائے تو پورے باغ یا ماحول کی دل کشی میں بدنامی کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ ادب و فن کی قدریں بدلتی رہتی ہیں لیکن فن کار کا فرض اور منصب زندگی کے حسن میں نکھار پیدا کرنا اور ناہمواریوں کو ہموار کرنا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن اور موثر ثابت ہو سکتا ہے کہ فن کار زندگی کی اعلیٰ اقدار کا ادراک رکھتا ہو۔ یہ بلند حوصلگی ماڈیت سے روحانیت کی جانب سفر کرنے سے ملتی ہے۔ اس کے سوتے مشرق کی اخلاقی روایات سے پھوٹتے ہیں جن سے سیراب ہونے کے لیے موسیقی، فن تعمیر، علم و حکمت، فکر و فلسفہ اور شعر و ادب کا عمیق مطالعہ ضروری ہے۔ جب ہم تحقیق و تجسس کی اس وادی میں قدم رکھتے ہیں تو یہاں ہمیں بے شمار تداور

شخصیتیں ملتی ہیں جو ایک سے دوسرے کی جانب ہماری راہ نمائی کرتی ہیں۔ یہ ”پروس“ کچھ ایسا قدرتی ہے کہ ہمارا ذہن خود بہ خود صاف ہوتا چلا جاتا ہے اور احساس تنہائی، ناامیدی، خوف و ہراس کی جگہ زندگی کے روشن پہلو ہماری نظروں کا محور بن جاتے ہیں جس سے ہم پوری انسانی برادری کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ اسی اکائی کی بدولت ہمیں اخلاقی اقدار سے انحراف کرنے والے مغرب کے Evil minded بھی ملتے ہیں جن کا شجرہ افروداتی زہر (Aphrodite) کیو پڈ ”Eros“ کی والدہ محترمہ سے ملتا نظر آتا ہے، سو ہمیں اس طبقے کی لایعنیت کے فلسفے کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ اس میں ہمیں ۱۸۷۰ء کے فرانس میں اخلاقی فلسفیوں، ڈرامہ نگاروں اور ادیبوں کا گروہ بھی ملتا ہے جس کے ہیروز میں ”اکساندے دوما“ اور ”ایفرے ناکے“ ہیں، جن کی اخلاق سے عاری تحریروں نے (Licentious ness) زندگی، آوارگی اور نفس پرستی کو فروغ دیا۔ ازاں بعد ان کے پیروکار ”پیرالوئی“ ہنری بیتائی اور پول آداں (Paul adan) نے شرم و حیا کی وہ دھجیاں اڑائیں کہ شیطان بھی انگشت بہ دندان ہے۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں میں سپیرو وولف (Pierre Wolff) اور گیتان لیرو بھی ڈرامہ Lelyey میں فحاشی کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر ڈریسڈیل اور ”پول روبین“ اپنی تحریروں میں گناہ کو ثواب بنانے میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اور پھر..... سفر و سفر کے توسط سے یہی تحریک اردو ادب میں درآئی، جسے روکنے کے بجائے ہمارے ادب کے بعض ”بقراطوں“ نے اسے پھیلانے کی کوششیں کی ہیں اور نئی نسل کے کچھ ”گنے پونے“ سر بھروں کو اس مفروضے کی بیساکھیوں پر کھڑا کرنے کی کوششیں جاری ہیں، لیکن پوری کی پوری نئی نسل اپنا ج نہیں ہے۔ اسے اپنے تہذیبی ورثے کا علم ہے اور وہ اپنی ذہنی توانائی کے لیے اس سے استفادہ بھی کر رہی ہے۔ اس کی نظریں مغرب کی سیاسی، تہذیبی، سماجی اور معاشرتی قدروں پر بھی ہیں اور اس سے پیدا ہونے والے ادب پر بھی، لیکن تقلید کے لیے نہیں عبرت کے لیے۔ اس کا اصل سرمایہ اپنی تہذیب و معاشرت اور اپنا تحریری ادب ہے جس کی تقلید میں خود مغرب نے تہذیب کی روشنی حاصل کی تھی یعنی:

”ہمارے“ علم کے موتی، کتا ہیں اپنے آبائی جو دیکھیں ان کو یورپ میں تودل ہوتا ہے سی پارہ

(جلد: ۲، شماره: ۳)

قدیر شیدائی

وادی کشمیر اور خانوادہ خوشی محمد ناظر

قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اس کو خوش گوار آب و ہوا، بار آور زمین، فلک بوس پہاڑ، شفاف جھیلیں اور پگھلی ہوئی چاندی جیسے بہتے دریاؤں کے ساتھ ساتھ رنگارنگ پھولوں، لذیذ پھسلاؤں اور پرکشش مناظر عطا کر کے اسے بہشت ارضی بنا دیا ہے۔

کشمیر کی پیالہ نما وادی لمبائی میں اسی میل کے قریب اور چوڑائی میں بیس تا تیس میل ہے۔ اس کے گرد و پیش برف کا لباس پہنے ہوئے دیوقامت پہاڑ اس طرح ایستادہ ہیں جیسے کسی قصر شہنشاہی کے چاروں جانب محافظ مودب کھڑے ہوں۔

ہمارے ایک دوست شمس کشمیری (مرحوم) نے لکھا ہے کہ:

”وادی کشمیر الف لیلوی کہانیوں کی سر زمین معلوم ہوتی ہے۔ جس میں داخل ہونے کے لیے سالوں سفر کر کے جادوئی دیواروں اور فلک بوس پہاڑوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ خشک پہاڑی راستوں کے اختتام کے بعد کشمیر کی حسین وادی دیکھ کر اچانک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی شہزادی کو کسی دیونے دشوار گزار پہاڑوں کے قلعہ میں قید کر رکھا ہو اور اس قلعہ میں آنے جانے کے دو ہی راستے ہیں۔ ایک کھلا آسمان اور دوسرا جہاں سے اس کے پانی کا باہر کی طرف اخراج ہوتا ہے۔“

کشمیر کی وادی کو ایک ایسی اوک سے بھی تشبیہ دی جاسکتی ہے جو کسی بیبا سے شخص نے اپنی پیاس بجھانے کے لیے کسی آبشار کے سامنے پھیلا رکھی ہو اور فالتو پانی اس کی کلائیوں سے ابھرا بھر کر نیچے گر رہا ہو یا پھر آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وادی کشمیر دعا کے لیے اٹھائے ہوئے وہ ہاتھ ہیں جو زمین نے اپنے حسن کو لافانی بنانے کے لیے قدرت کے سامنے پھیلا رکھے ہیں اور وہ قبولیت کی سند بھی حاصل کر چکے ہیں۔ ہاں جس دن اس کے باسیوں کے بہتر مقدر کی قبولیت بھی اس میں شامل ہوگی اس دن سے یہ واقعی جنتِ ارضی بن جائے گی۔

دنیا میں سطح سمندر سے اتنی بلندی پر اتنی بڑی یہ اپنی قسم کی واحد وادی ہے جس کے چپاروں طرف اونچے دشوار گزار پہاڑ ہیں۔ ایک طرف بلکہ دو طرف پیر پینال کے بلند پہاڑ ہیں، جن کی بلندی دس سے چودہ ہزار فٹ تک ہے تو ایک سمت ہمالیہ کا مشہور ترین سلسلہء کوہ ہے جو بارہ ہزار سے بیس ہزار فٹ تک اونچائی میں ہے اور اس سے مزید آگے قراقرم کا فلک بوس پہاڑی سلسلہ ہے جہاں

□

نے فوراً اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کر دیا کہ حضور اگر اسے اپنی خادمہ ”میراں“ پری بخش دیں تو وہ یہ کام سرانجام دے سکتا ہے۔ حضرت سلیمانؑ اس کے سوال پر مسکرا دیے اور اسے اجازت دے دی۔ اس نے جنوب مغربی کونے کو، جو کم بلند حصہ تھا اور آگے تمام سطح نیچی تھی، پتھر کی چٹانیں ہٹا دیں۔ پانی اچھل کر نکلا اور آہستہ آہستہ جھیل خالی ہو گئی۔ اس طرح وادی کی شکل نکل آئی۔ وادی کے عین وسط میں چشموں کا پانی لیے چھوٹا سا دریا رہ گیا، جس نے اپنے لیے رستہ خود متعین کر لیا۔ کچھ چھوٹی چھوٹی جھیلیں باقی رہ گئیں کیوں کہ وہ مزید نیچی سطح پر تھیں۔ چنانچہ اس پہاڑی کو تخت سلیمان کا نام ملا جو سری نگر شہر سے متصل ڈل جھیل کے کنارے پر ہے اور جہاں ہندوؤں کا مشہور مندر رشنکر چاریہ ہے۔ کاشو جن اور میراں پری کے مشترکہ نام سے وادی کا نام شو میر پڑا جو بعد میں کشمیر بن گیا۔ اس سلسلے میں دوسری کہادت ہندو دیومالی قسم کی ہے۔ اس کے مطابق بھی وادی کشمیر ایک جھیل کی صورت میں تھی۔ ساری دنیا کے راہب اور عبادت گزار لوگ اس کے پاس اونچے پہاڑوں کی غاروں میں آ کر عبادت کرتے تھے۔ کشب رشی بھی ان لوگوں میں سے تھا جو جھیل کے کنارے پر اپنی تپسیا میں مصروف رہتا تھا۔ جھیل کے پانی میں راکھ شس رہتے تھے جو کشب رشی کی عبادت میں مداخلت کرتے اور اسے تنگ کرتے تھے۔ کشب رشی نے اپنی تکلیف ”جل دیوتا“ کو بتائی۔ اس نے راکھ شسوں کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ قابو میں نہ آئے۔ اس لیے اسے قوت کے دیوتا سے رجوع کرنا پڑا۔ جس نے کرودھ میں آ کر پہاڑوں پر اپنا ترشول مارا جس سے پہاڑ ہٹ گئے اور پانی کو رستہ مل گیا۔ پانی کے نکل جانے سے راکھ شسوں کو ختم کر دیا گیا اور نیچے سے وادی نکل آئی جو آبدہ ہو کر کشب رشی کے نام کی نسبت سے کشب مرکہلوائی پھر آہستہ آہستہ اس کا نام کشمیر بن گیا۔ علاوہ ازیں کشمیر کی وجہ تسمیہ میں اور بھی کئی روایات تاریخ نگاروں نے بیان کی ہیں۔

بہر حال اس وادی کا نام کشمیر پڑنے کی کوئی بھی وجہ ہو لیکن یہ بات یقینی ہے کہ وادی کبھی پانی کی جھیل تھی کیوں کہ ارد گرد پہاڑوں پر پانی کے نشانات اور درمیان میں موجود ”کرواہ“ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ کبھی وہ پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور پھر پہاڑوں پر خاصی بلندی پر چھیلیوں کے جنچر بھی دریافت ہوئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ واقعی یہ وادی کبھی جھیل تھی اور کسی وجہ سے جب رستے کے پہاڑ ہٹ گئے اور پانی کو نکلنے کا رستہ مل گیا تو وادی ظاہر ہو گئی۔

وادی کشمیر بلند ترین پہاڑوں میں گھری ہوئی خوب صورت، الگ تھلک جگہ تھی جہاں عبادت گزار اور راہب قسم کے لوگ گوشہ نشینی اختیار کرتے اور سکون سے عبادت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ آبادی بڑھتی گئی۔ لیکن اپنی مخصوص آب و ہوا اور مزاج کے لحاظ سے لوگوں کا رجحان بھی فطرت کے قانون کے مطابق نرم ہی رہا۔ جب بدھ مت کو عروج حاصل ہوا اور اشوک و کنگ جیسے بڑے

سار سال برف پڑی رہتی ہے۔ یہیں دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو (2-K) موجود ہے۔ وادی کے نیچے کی سمت مغربی کونے میں سلسلہ کوہ قاضی ناگ ہے جس کے اوپر پیچھے ناگ پربت کی اونچی چوٹی مسکراتی نظر آتی ہے۔ پیر پنجال کے مشرقی حصے میں درہ بانہال کے دامن میں سے چشمہ ویری ناگ سے دریائے جہلم اچھلتا کودتا نکلتا اور ایک نالے کی صورت بہنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں کلڑناگ اچھال کے چشموں اور کئی دوسرے ندی نالوں کا پانی شامل ہوتا جاتا ہے۔ بعد ازاں اسلام آباد کے قریب کھنبل کے پاس لدھڑ ندی بھی اس میں آلتی ہے تو یہ باقاعدہ دریا کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں سے آگے اس میں وادی کے آخر یعنی بارہ مولا تک کشتی رانی ہو سکتی ہے۔ دریائے جہلم وادی کشمیر میں اس طرح سے ہے جیسے انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ وہ وادی کے عین وسط میں بہتا ہے اور دونوں طرف کے ندی نالوں کا پانی اس میں شامل ہوتا جاتا ہے۔ ایک طرح سے کشمیر کے حسن کا انحصار، جہاں خوب صورت گھنے جنگلات، خوش نما سبزہ زاروں دل فریب جھیلیں چشموں اور پشت پر فلک بوس برف پوش پہاڑوں پر ہے، وہیں دریائے جہلم کا رواں پانی بھی اس کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

یہ شوخ و شنگ دریا وادی سے باہر آ کر تیز و تند موجوں کے ساتھ تیز رفتاری سے بہتا ہے لیکن وادی کے اندر اس شرافت سے رواں ہے کہ پانی کی حرکت بھی بعض دفعہ مشکوک دکھائی دیتی ہے، وادی کی اسی میل کی لمبائی میں صرف اڑھائی سو فٹ کے قریب اترائی ہے۔ وادی کے بیشتر قصبے اور شہر اسی دریا کے کنارے پر آباد ہیں۔ اچھال، بجی بہاڑہ کھنبل، اسلام آباد (تھوڑا سا ہٹ کر ہے) اونتی پورہ، پام پور، سری نگر، شادی پور، سٹن، ہاجن، سنبل، بانڈی پورہ، سو پور، بارہ مولا یہ سب تو وادی کے اندر ہیں اور وادی سے باہر رام پور، اوڑی چلوٹی، چناری، ہٹیاں، گڑھی دوپٹہ، دومیل (جو آب مظفر آباد ہی کا حصہ ہے) ولائی کوہالہ منگلہ جیسے مشہور مقامات ہیں۔ وادی کشمیر کے آباد ہونے اور اس کے نام کے متعلق کئی کہاوٹیں مشہور ہیں۔

ایک روایت کچھ یوں ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے خادموں سمیت، جن میں جن اور پریاں بھی شامل تھے، اڑن تخت پر بیٹھے فضائی وسعتوں پر پرواز کر رہے تھے کہ انھیں بہت بڑی جھیل نظر آئی، جو لبالب پانی سے بھری ہوئی تھی اور اس کے چاروں سمت برف پوش پہاڑ ایستادہ تھے۔ عین جھیل کے کنارے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی جس کا سرا جھیل کے پانی کے اوپر تھا۔ انھیں یہ منظر پسند آیا اور انھوں نے تخت کو اس چھوٹی پہاڑی پر اتارنے کا حکم دیا۔ حضرت سلیمانؑ نے حاضرین سے کہا کہ اگر یہ جھیل پانی سے خالی کر دی جائے اور اس کا پانی نیچے کی طرف نکال دیا جائے تو یہاں ایک وادی نکل آئے گی، جو آبدہ ہو کر نہایت خوش نما ہوگی۔ ان کا خادم کاشو جن جیسے ایسے ہی کسی موقع کا منتظر تھا، اس

حکمرانوں نے اس مذہب کو اختیار کر لیا تو یہاں کے لوگ بھی بدھ مت کے بہتر اصولوں کی وجہ سے بدھ مت میں داخل ہوتے گئے، لیکن بعد میں جب اسلام کی روشنی پھیلی اور چند اولیاء کرام وادی کشمیر میں تشریف لائے تو ان کے بہترین اخلاق اور اسلام کے فطری اصولوں نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا اور لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ تہنی نسل کا بادشاہ رنجن بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد اسلام عام لوگوں میں پھیلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وادی کشمیر میں مسلمان واضح اکثریت میں ہو گئے۔ مسلمان بادشاہوں کے دور میں، باوجود اس کے کہ وادی میں نوے فیصد سے بھی زیادہ مسلمان آبادی تھی، غیر مسلموں سے اچھا سلوک ہوتا رہا۔ کشمیر شروع ہی سے ایک الگ ملک شمار ہوتا تھا اور یہاں کے بادشاہ خود مختار ہوتے تھے۔ بلکہ موجودہ سرحد اور پنجاب کے بہت سے علاقے بھی ان کے زیر تسلط رہے۔ کشمیر کے تجارتی تعلقات شروع ہی سے چینی اور روسی علاقوں سے رہے ہیں۔ ہر سال گرمیوں کے موسم میں جب رستے کھلتے تو یہاں سے تجارتی قافلے ان ملکوں میں جاتے اور وہاں سے تجارتی قافلے یہاں آتے۔ یار قندی، سمرقندی اور تبتی تاجروں کی سرانیں تو سری نگر میں تاحال قائم رہی ہیں۔ قایلین سازی اور دوسری کئی صنعتیں وہیں سے کشمیر میں آئیں اور ان روابط نے کشمیری تہذیب و معاشرت پر بھی اثر ڈالا۔ اسی طرح کشمیر میں اسلام چونکہ ایرانی علماء اور اولیاء کرام کے ذریعے پھیلا اس لیے ایرانی صنعتیں اور تمدن کشمیری تمدن پر خاصے اثر انداز ہوئے بلکہ کشمیر کو آج تک ایران صغیر کہا جاتا ہے۔ مغل بادشاہ کشمیر کے اتنے گرویدہ تھے کہ وہ گرمیوں کے موسم میں اپنے لاؤ لشکر سمیت کشمیر کا چکر ضرور لگاتے۔

مغلوں کے زوال کے بعد پنجاب کے ساتھ ساتھ کشمیر پر بھی سکھ قابض ہو گئے۔ بعد میں انگریزوں سے پنجاب میں شکست کھانے کے بعد سکھ کشمیر سے بھی رخصت ہوئے تو سکھوں ہی کے گورنر گلاب سنگھ ڈوگر نے انگریزوں سے ریاست معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء کے تحت خرید لی۔ ہندوستان میں مغلوں کے زوال کے بعد انگریز رفتہ رفتہ پورے ہندوستان پر قابض ہونے کا پروگرام بنانے لگے جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے۔ اس وقت صوبہ پنجاب کی عنان حکومت مہاراجہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ اسے انگریزوں کے پنجاب کی سمت بڑھتے آنے پر فکر لاحق ہوئی لیکن خود میں متاثر نہ ہونے کا پروگرام بنانے لگے۔ تاب نہ پا کر وہ خاموش رہا حتیٰ کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد انگریز فوج فتح و نصرت کا پرچم لہراتے قلعہ لاہور میں داخل ہو گئی۔ لاہور میں سکھوں اور انگریزوں کے مابین ایک معاہدہ ہوا جو معاہدہ لاہور کے نام سے منسوب ہے۔ اس کی رُو سے دو آہ بست جانندھر پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا اور سکھوں کو ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ منظور کرنا پڑا۔ لیکن سکھوں کے لیے اس تاوان کا ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ بالآخر انگریز نے کشمیر کا علاقہ ۵ لاکھ روپے میں مہاراجہ گلاب سنگھ

کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے کشمیر کی حکومت ہاتھ میں لیتے ہی سکھوں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے۔ انگریزوں کے لیے یہ قطع تعلق غنیمت تھا۔ انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لاہور پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۵۷ء میں رنجیت سنگھ کو گلاب سنگھ کی گدی ملی جس نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور انگریز نے پنجاب میں پورا تسلط جمایا۔ ۱۸۸۵ء میں حکومت کشمیر کی بھاگ دوڑ مہاراجہ پر تاپ سنگھ کے ہاتھ آئی اور ۱۹۲۵ء میں اس کا بھتیجا ہری سنگھ گدی پر بیٹھا جس کے مظالم نے کشمیری مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ پھر ایک صدی تک ڈوگروں نے کشمیر یوں کا وہ حال کیا جو تاریخ عالم میں کسی حاکم نے اپنے محکوموں پر نہ کیا ہوگا۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ لیکن کشمیر میں یہ سورج پھر بھی گہن میں رہا۔ کشمیر کی ریاست کے ڈوگرے ہندو حکمران کی نادانی کی وجہ سے بھارتی ہندسوں نے سازش کے تحت کشمیر کو ایک دفعہ پھر ماؤنٹ بیٹن سے خرید لیا اور اس طرح کشمیر پھسر بھارت کی جھولی میں جا گرا۔

پونجھ، میر پور اور مظفر آباد کے جیلے اور بہادر مسلمانوں نے اپنے سرحدی بھائیوں سے مل کر کچھ علاقہ آزاد کر لیا۔ ادھر گلگت اور بلتستان کے بہادر عوام نے اپنے علاقے سے ڈوگرہ فوج کا صفایا کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ باقی حصہ ابھی تک بھارتی فوجوں کے تسلط میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ انھوں نے کشمیری مسلمانوں کی زندگی کو دو بھر کر رکھا ہے۔

مغلیہ عہد کی تاریخ اور کشمیر میں مسلمانوں کی یادگاریں اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ مسلمانوں نے کشمیر کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ مغلیہ بادشاہوں کے فن تعمیر اور ان کے ذوق جمیل نے کشمیر میں جگہ جگہ اتنی خوب صورت اور یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں کہ سکھوں اور ڈوگروں کے اجد پنا اور تحسرتی حربوں کے باوجود آج تک اپنی رعنائیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ کشمیر کے شالیمار باغ کی تعمیر کشمیر سے ان کی دلی وابستگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہمارے ممدوح ڈوگرہ راج کے پہلے مسلمان گورنر اور مشہور چوٹی کے شاعر چودھری خوشی محمد ناظر اپنی ایک نظم ”فردوس زمیں“ میں کشمیر کے قدرتی حسن کی تعریف اور شالیمار باغ کا نقشہ اپنے اشعار میں یوں کھینچتے ہیں:

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا
میری آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا
مگر عالم میں اے گلزار کشمیر
کوئی خلد بریں تجھ سانہ دیکھا
چمن زاروں میں آب جو کا منظر
وہ موج سیم کا لہرانا دیکھا
وہ کوہ برف پر تنویر خورشید
پھر ایسا آتشیں دریا نہ دیکھا
وہ ہر سوسیم گوں تالاب دیکھے
کہ ایسا کوئی مہ سیمانہ دیکھا
کنول کے پھول پر جس دم نظر کر
مے گل رنگ کا پیمانہ دیکھا

شفیق کی جلوہ ریزی بادلوں میں
چھتوں پر لالہ و گل کا سماں ہتا
وہ ہر جانب تماشاے لب بام
سیہ چشموں کی اک ترچھی نظر سے
اسی کیف تماشا میں سر شام
سماں پھر چاندنی کا اس چمن میں
وہ دیکھا خواب میں رنگیں مرقع

دھندلا آسماں پر چھرا ہتا

زمیں پر ابرسا ہتا

کہ موسیٰ نے بھی یہ سینا نہ دیکھا
تو پائیں باغِ سخن خانہ دیکھا
وہ ہر سو کوچہ حبانانہ دیکھا
غزال دشت کو دیوانہ دیکھا
وہ مثالا مار کا مے حسانہ دیکھا
سکوت شب میں خاموشانہ دیکھا
کہ بے داری میں پھرا ایسا نہ دیکھا

حسراماں وادیوں کو آ رہا ہتا
نسیم صبح کو مہکا رہا ہتا
ریاضِ حنلد کو شرم مار رہا ہتا
تو آبِ جوا چھلتا حبا رہا ہتا
رو پہلی پھول سے برسا رہا ہتا
چمن میں چاندنی چھٹکا رہا ہتا
کہ شعلہ طور کا شرم مار رہا ہتا
کہ سرتاپا گلستاں گار رہا ہتا
تجلِ سافضا پر چھرا رہا ہتا
کہانی ہر طرف دہرا رہا ہتا
شہنشاہی علم لہرا رہا ہتا
جلوسِ خسروی شرم مار رہا ہتا
شکوہِ بزمِ حرم دکھلا رہا ہتا
در و دیوار کو چکا رہا ہتا
جمالِ یوسفی گہنا رہا ہتا
زمانے کو دکھایا حبا رہا ہتا
سرودِ آسمانی گار رہا ہتا
رگِ جاں میں لہو دوڑا رہا ہتا

اٹھا تھا جھوم کر وہ گھاٹیوں سے
شمیمِ روح پرور سے گلستاں
چناروں کے قدِ بالا سے طوبی
ہتا فواروں کا ہر سو رقص پیہم
یہ فوارہ ہتا یا سیالِ گلبن
یہ سیمیں سلسلہ آبِ رواں کا
وہ عالم نور کا ہتا بزمِ گل پر
تھے طائرِ نغمہ خواں شاخ و شبر پر
ترنم سا ہوا میں بس رہا ہتا
صدائے کوس و طبلِ شہریاری
ادھر ریشکِ درفش کاویانی
ادھراک وارش اورنگ اکبر
شہِ جم جاہ نور الدین جہانگیر
ادھر نورِ جہاں کا جلوہ حسن
فروغِ عارضِ مہر النساء سے
وہ حسن و عشق کا مغلی مرقع
ادھر محو نوا سمرست مطرب
وہ تارِ چنگ و بربط کی تڑپ سے

وہ تھی دربار کی شان آشکارا
کہ بندوں کو خدا یاد آ رہا ہتا
یہ نقشہ دیکھ کر بزمِ شہی کا
سروشِ غیبی شرم مار رہا ہتا
اگر فردوسِ برزخ زمیں است
”ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است“
ماہر کشمیریات جناب کلیم اختر (مرحوم) لکھتے ہیں:

اردو زبان کے ممتاز اور معروف شاعر چودھری خوشی محمد ناظر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے
فارغ التحصیل تھے اور ریاست جموں و کشمیر میں خان بہادر غلام احمد ریونیوسٹر کے ایما پر
آئے تھے۔ آپ کو ریاست میں گورنر اور ریونیوسٹر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ ۱۹۲۳ء
میں آپ ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور ۱۹۲۹ء سے چک جھمرہ ضلع فیصل آباد میں
رہائش اختیار کی۔ موسم گرما سری نگر میں گزارتے۔ ”کیم اکتوبر ۱۹۴۴ء کو سری نگر میں
انتقال ہوا اور وہاں پر یہی سپرد خاک ہوئے۔

ماہ نامہ ”دھک“، شمارہ ستمبر ۱۰/۹ ستمبر اکتوبر ۱۹۹۵ء

خوشی محمد ناظر کی نظم ”جوگی“ کا شمار اردو ادب کے کلاسیک میں ہوتا ہے اور یہ اشعار تو زبان
زخو خاص و عام ہیں:

کل صبح کے مطلع تاپاں سے خورشید کا نور ظہور ہوا

سب چاند ستارے ماند ہوئے، کل عالم بقعہ نور ہوا

تن من کو دھن میں لگاتے ہو ہر نام کو دل سے بھلاتے ہو

مائی میں لعس گناتے ہو تم بندہ حرص و ہوا بابا

دھن دولت آئی حبانہ ہے یہ دنیا رام کہانی ہے

یہ عالم عالم منانی ہے باقی ہے ذاتِ خدا بابا

ناظر کا شعری مجموعہ ”نغمہ فردوس“ بیسویں صدی کے ربیع ثانی کی نظم گوئی میں خاص اہمیت کا
حامل ہے۔ اس دور کے نظم گو شعرا تلوک چند محروم، سیما اکبر آبادی، چلبست لکھنوی، سرور جہاں آبادی
سے ان کا مرتبہ نظم گوئی کسی طور کم نہیں تھا بلکہ اپنی متذکرہ نظم ”جوگی“ کے حوالے سے ان کی شہرت اپنے
ہم عصروں میں نمایاں رہی اور اس دور کے حوالے سے کوئی ادبی تاریخ ان کے ذکر سے خالی نہیں۔

ایک جانب ان کا یہ مرتبہ شعری اور دوسری جانب ان کی اولاد نے بھی ان کے نام کو تادمِ آخر
اپنی علمی و سیاسی صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رکھا۔ چودھری خوشی محمد ناظر کے پانچ بیٹے تھے۔ ناظر نے
کشمیر کی گورنری کے زمانے میں ریاستی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو خدمات انجام دی تھیں،

وہ انتہا پسند ہندوؤں کے لیے کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی اور پھر ان کے بیٹے حمید اللہ خان بھی ریاستی اسمبلی ”پرچاسجا“ میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے تحریکیں پیش کرتے رہتے تھے چنانچہ خانوادہ ناظر کے لیے ان کے سینوں میں بغض و کینہ موجود تھا لیکن وہ کبھی چودھری صاحب کا سامنا نہ کر سکے۔

خوشی محمد ناظر کے پانچ بیٹے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے پانچوں بیٹوں، جولاءِ گریجویٹ بھی تھے، چودھری فیض اللہ چودھری عنایت اللہ چودھری حبیب اللہ چودھری اکرام اللہ اور چودھری حمید اللہ خان نے ان کے مشن کو جاری رکھا اور قوم کی بہتری کے لیے ہمیشہ سینہ سپر رہے۔ اگرچہ آج ان میں سے کوئی بھی بقید حیات نہیں لیکن اپنی خدمات کی ایک طویل فہرست وہ اپنے پیچھے ضرور چھوڑ گئے ہیں جس کی بدولت آج ان کی اولاد ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور ان کی عوامی مقبولیت و پزیرائی میں کہیں کوئی فرق نہیں آیا۔

چودھری حمید اللہ خان نے اپنی ابتدائی تعلیم جموں اور سری نگر کے سکولوں میں حاصل کی۔ بی۔ اے پی ڈی بیو کالج جموں سے کیا۔ پھر ایل ایل بی کی ڈگری لاہور سے حاصل کی اور ریاست میں پریکٹس شروع کر دی۔ ساتھ ہی ساتھ سیاست میں کود پڑے۔ چودھری حمید اللہ خان کے سبھی بھائی سرکاری ملازمتوں میں تھے جن میں چودھری فیض اللہ خان ریاست میں وزارت کے عہدہ تک پہنچے تھے۔ جب ۱۹۴۷ء میں جنگ آزادی کشمیر شروع ہوئی تو اس وقت آپ بارہ مولا کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بھارتی فوج نے انھیں پاکستان دوستی کے الزام میں گرفتار کر لیا اور سری نگر لا کر لال چوک میں ان کی توہین کی۔ (یہ ایک الگ داستان ہے)

چودھری حمید اللہ خان کے ایک بزرگ جو چودھری خوشی محمد ناظر کے کزن تھے، ریاست میں چیف سیکرٹری کے عہدہ تک پہنچے۔ ان کا اسم گرامی چودھری نیاز احمد تھا۔ ان کے فرزند چودھری خورشید احمد تھے جو ریاستی اسمبلی کے رکن تھے اور ”گوجر جاٹ کانفرنس“ کے لیڈر تھے۔ افسوس کہ وہ جوان مرگ ہو گئے۔

چودھری حمید اللہ خان نے اپنا سیاسی سفر آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس سے کیا اور چودھری غلام عباس کے ہم قدم اور ہم آواز رہے۔ یہ وہ دور تھا جب ریاست میں تحریک شدت سے جاری ہو چکی تھی اور عوام نے ڈوگرہ سامراج کے خلاف جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک کے اس دور میں چودھری حمید اللہ خان ایک جوان سیاسی کارکن کی مانند متحرک رہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب ریاست میں ”متحدہ قومیت“ کا غوغا اٹھا اور آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدلنے کی کوششیں شروع ہوئیں تو اس وقت جن لوگوں نے دو قومی نظریہ کی حامل جماعت مسلم کانفرنس قائم رکھنے کی سعی کی، ان میں چودھری حمید اللہ خان شامل تھے۔

دراصل شیخ محمد عبداللہ متحدہ قومیت کے رنگ میں رنگے جا چکے تھے اور وہ ریاست میں ایک ایسی جماعت بنانے پر تامل گئے تھے جس میں ہر مذہب و ملت کے افراد شامل ہوں۔ دراصل یہ کانگریس کی درپردہ ایک سازش تھی۔ جس کا مقصد مسلم تحریک کا رخ موڑنا تھا۔ جب مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس اس سلسلہ میں سری نگر میں منعقد ہوا تو اس میں جموں کے جن سیاسی قائدین نے حصہ لیا ان میں چودھری غلام عباس، اے آرسا غرا اور چودھری حمید اللہ خان شامل تھے۔ چودھری حمید اللہ خان نے اس تحریک کی مخالفت کی۔ خواجہ محمد یوسف صراف نے اپنی کتاب Kashmir Night for Freedom (حصہ اول) کے صفحہ ۵۳۵ پر لکھا ہے کہ جن لوگوں نے دو قومی نظریہ کی حمایت کی اور نیشنل کانفرنس بنانے کی مخالفت کی، ان میں چودھری حمید اللہ خان، مولوی رفیع الدین، غلام حیدر غوری، مولانا محمد عبداللہ ایڈووکیٹ، شیخ احمد الدین بہنالی اور خواجہ غلام احمد گسال آف بھدروہ شامل ہیں۔ ایک اجلاس میں چودھری حمید اللہ خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب تک مسلمانوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب مسلم کانفرنس کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور نیشنل کانفرنس کبھی مسلمانوں کے لیے کام نہیں کرے گی۔ مسلمان دوسروں کے مقابلے میں اس وقت غیر منظم اور پسماندہ ہیں۔ اس لیے اگر مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا تو دوسرے مسلمانوں کی اس پسماندگی کا فائدہ اٹھائیں گے۔ کشمیری پنڈتوں کی سیاست صرف ملازمتوں کے حصول تک محدود ہے۔ اس لیے ان سے کسی تعاون کی توقع عبث ہے اور اس وقت جو پنڈت ہمارے ساتھ ہیں، ان کو اپنی قوم کا اعتماد حاصل نہیں ہے اور اس لیے یہ دانائی نہیں ہے کہ ہم انھیں اپنے گھر کی وہ چیزیں دے دیں جو ہمارے پاس ہیں۔ چودھری حمید اللہ خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

”طاقت و راہ کمزور کے مابین اتحاد نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ دونوں اکٹھے سفر نہیں کر سکتے۔

جموں میں ہندو سرماہ دار ہیں اور مسلمان غریب ہیں۔ ان کے مابین اتحاد و اشتراک ناممکن ہے۔ راج پوتوں کو اپنے حکمران ہونے کا زعم ہے اس لیے وہ اتحاد کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، لہذا کوئی دوسری قوم ایک ایسی بھی آزادی کی تحریک میں نہیں آ رہی، اس لیے آپ کیوں اپنی تنظیم کو تبدیل کر رہے ہیں۔“

یہ واقعہ ۱۰ جون ۱۹۳۹ء کو سری نگر میں پیش آیا۔ بہر حال چودھری غلام عباس اور جناب اے آرسا غریبی نیشنل کانفرنس میں چلے گئے۔ ۱۹۴۰ء مارچ میں جب لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تو اس کا اثر ریاستی سیاست پر ہونا فطری اور لازمی تھا۔ ریاستی عوام نے قائد اعظم محمد علی جناح کی آواز حق پرست پر لبیک کہا تو مسلم کانفرنس کے جن لیڈروں نے نیشنل کانفرنس سے علیحدگی اختیار کر لی ان میں چودھری غلام عباس سرفہرست تھے جو مسلم کانفرنس کو نیشنل کانفرنس میں تبدیل کرنے والوں

میں پیش پیش تھے۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کو چودھری غلام عباس اور میر واعظ مولانا محمد یوسف شاہ نے دوبارہ متحرک کیا۔ اس وقت مسلم کانفرنس کے جن لیڈروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ایک تو اے آرساغر تھے اور دوسرے چودھری حمید اللہ خان تھے، جنھوں نے مسلم کانفرنس کی تنظیم کے لیے دورے کیے اور دیہاتوں اور دور افتادہ مقامات پر جا کر کام کیا۔

دراصل حکومتی سطح پر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کے لیے ایک نئی تنظیم بن گئی تھی، جس کا نام گوجر جٹ کانفرنس تھا۔ اس سے مسلمانوں کے اتحاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ مگر اس محاذ پر سب سے زیادہ کام چودھری محمد عبداللہ خان بھلی نے کیا جو صوبہ جموں مسلم کانفرنس کے صدر اور دیہاتی برادری کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ ان کے ساتھ چودھری حمید اللہ خان تھے۔ چودھری حمید اللہ خان صوبہ جموں مسلم کانفرنس کے مدتوں صدر رہے۔ آپ ۱۹۳۷ء میں ریاستی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ پہلی اسمبلی ۱۹۳۴ء میں جموں سے، جو دور کن منتخب ہوئے، ان میں چودھری محمد خان بھلی اور شیخ محمد امین تھے۔ دوسری اسمبلی میں چودھری حمید اللہ خان اور جناب اے آرساغر تھے اور تیسری اسمبلی ۱۹۳۶ء میں چودھری حمید اللہ خان اور چودھری غلام مصطفیٰ طور تھے۔ ۱۹۳۶ء میں چودھری حمید اللہ خان جموں کے شہری حلقے سے رکن اسمبلی بنے۔ ان کا مقابلہ ایک دوسرے مسلم کانفرنس شیخ محمد رفیق ٹھیکیدار سے ہوا تھا۔ اس وقت مسلم کانفرنس دو واضح گروپوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے قائدین چودھری غلام عباس، اے آرساغر، آغا شوکت علی، میر واعظ نور الدین، غلام محمد الدین رہبر، محمد اسماعیل ساغر جیلوں میں بند تھے۔ ان کی گرفتاریاں نومبر ۱۹۳۶ء میں سول نافرمانی کی تحریک کے سلسلہ میں ہوئی تھیں۔

آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے قائم مقام صدر چودھری حمید اللہ خان تھے اور سیکرٹری جنرل کے فرائض پروفیسر محمد اسحاق قریشی ادا کر رہے تھے۔ میر واعظ کشمیر مولوی محمد یوسف شاہ مجلس عمل کے صدر تھے۔ مسلم کانفرنس نے اسمبلی میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور چودھری حمید اللہ خان اسمبلی پارٹی مسلم کانفرنس کے لیڈر تھے۔ سردار محمد ابراہیم خان انھی ماہ و سال میں اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ سے مستعفی ہو کر سیاسیات میں آئے تھے۔ انھوں نے پونچھ کے حلقے سے اسمبلی کا انتخاب جیتا تھا۔ ان کے لیے کرنل خان محمد خان نے نشست خالی کر دی تھی اور نوجوان سردار محمد ابراہیم خان کو خدمت قوم و وطن کا موقع بخشا تھا۔ اسی طرح سردار فتح محمد خان نے سردار یار محمد خان کو اپنی نشست پر کھڑا کر کے کامیاب بنایا تھا۔ ان کا تعلق بھی مسلم کانفرنس سے تھا۔

چودھری حمید اللہ خان بہترین پارلیمنٹین تھے اور ان کا شمار ریاست کے صف اول کے مقررین میں ہوتا تھا۔ اردو اور انگریزی زبانوں کے اچھے مقررین میں سے تھے۔ اسمبلی میں ان کی

بجٹیں اور تقریریں بڑے غور و فکر سے سنی جاتی تھیں اور آپ بھتیگی بھی بہت اچھی کہتے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں ریاستی اسمبلی کے آخری اجلاس میں حکومت نے ایک مسودہ قانون تحفظ وامن عامہ کے نام سے اسمبلی سے پاس کرنا چاہا تھا۔ یہ مسلمانوں کے خلاف قانونی جواز نامہ تھا۔ مولانا غلام مصطفیٰ نے اسے تخریب امن کا نام دیا، جب کہ قاضی عبدالغنی نے اسے حکم شاہی کہا اور سردار فتح محمد خاں نے کہا کہ اس قانون کی منظوری کے بعد ریاست میں بدترین حالات نمودار ہوں گے جن کی ذمہ داری حکومت پر ہوگی۔ اس قانون کی مخالفت میں ہم سے جو کچھ ہو سکے گا، کریں گے۔ چودھری حمید اللہ خان نے اسمبلی میں ایک تحریری بیان پڑھا اور مسلم گروپ کو لے کر ہال سے باہر نکل آئے۔ آپ نے کہا:

”میں اور میری پارٹی مسودہ قانون تحفظ امن و مفاد عامہ سے اظہار برات کرتے ہیں، جسے حکومت نمائندگان عوام کی مخالفت کے باوجود سرکاری اکثریت کے بل بوتے پر اس ایوان سے منظور کر دینا چاہتی ہے۔ موجودہ پرائم منسٹر کی پالیسی اس قدر مسلم کش اور رجعت پسندانہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو بغاوت اور آزادی کی جنگ لڑنے پر مجبور کر رہا ہے۔ یورپ اور ایشیا میں فیسٹی ازم کی تباہی کے بعد ہر قسم کے رائے عامہ اور مخالفت کو نازی طریقوں سے ختم کرنے میں حکومت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس بل کے خلاف ہمارا پہلا اقدام یہ ہے کہ ہم اسمبلی کی ممبریوں سے استعفیٰ پیش کرتے ہیں۔ عوام کے خلاف اس قسم کی فسطاطی اور غیر مہذب ہم کے باعث جو خطرناک نتائج پیدا ہوں گے اس کی تمام ذمہ داری پرائم منسٹر پر ہوگی۔“

چودھری حمید اللہ خان کو مسلم کانفرنس میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ ۱۹۳۴ء میں جب قائد اعظم محمد علی جناح جموں و کشمیر کے دورے پر آئے اور جموں میں ان کا شاہانہ استقبال ہوا تو اس وقت چودھری حمید اللہ بھی وہاں موجود تھے۔ بلکہ رات کو جب عید گاہ جموں کے میدان میں قائد اعظم محمد علی جناح کے اعزاز میں ایک عظیم الشان جلسہ عام منعقد ہوا جس میں قائد اعظم محمد علی جناح نے بد زبان انگریزی خطاب فرمایا تو اس تقریر کا رد و ترجمہ چودھری حمید اللہ خان نے اسی اندازِ جوش اور جذبہ سے کیا جیسا کہ سیالکوٹ کے جلسہ میں قائد اعظم کی تقریر کا ترجمہ سردار عبدالرب نشتر نے کیا تھا۔ چودھری حمید اللہ خان ایک قابل قانون دان ہونے کے علاوہ سپورٹس مین بھی تھے۔ ٹینس کے بہترین کھلاڑی تھے۔ کرکٹ اور فٹ بال میں بھی دلچسپی لیتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی چودھری اکرام اللہ خان تو ریاست کی فٹ بال ٹیم کے کپٹن تھے۔

چودھری حمید اللہ خان کی زندگی کے اہم واقعات ۱۹۳۶ء سے شروع ہوتے ہیں جب آپ کو مسلم کانفرنس کا قائم مقام صدر بنایا گیا۔ یہ ذمہ داریاں ان پر چودھری غلام عباس مرحوم نے ڈالی

□

بھارت دشمن انداز سیاست دیکھتے ہوئے جموں اور سری نگر میں پریس کانفرنس کیں۔ چودھری حمید اللہ خان کی ان پریس کانفرنسوں کو قائد اعظم محمد علی جناح کے متذکرہ بیان کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ بہر حال جلد ہی مسلم کانفرنس نے الحاق کی قرارداد چودھری حمید اللہ خان کی صدارت میں منظور کر کے تارخ کی کارنامہ سرانجام دیا۔ جونہی چودھری حمید اللہ خان کی صدارت میں یہ قرارداد منظور ہوئی، اس پر حکومت کشمیر نے چودھری صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے۔ چودھری حمید اللہ خان نے پونچھ کا دورہ کیا اور سردار محمد ابراہیم خان کے ساتھ جہاد کشمیر کا آغاز کیا۔ نومبر ۱۹۴۷ء میں آزاد حکومت قائم ہوئی جس میں صدر سردار ابراہیم اور وزیر اعظم چودھری حمید اللہ خان بنائے گئے۔

۱۹۴۷ء ماہ نومبر میں جموں میں خوں ریز فسادات ہوئے تھے۔ چودھری صاحب کے اہل و عیال جموں میں تھے، اور جب ۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو قافلے پاکستان جانے کے بہانے قتل کیے گئے تو ان میں چودھری حمید اللہ خان کے دونوں جوان بیٹے، انور حمید جو ایف کے طالب علم تھے اور ارشد حمید جو میٹرک میں پڑھتے تھے، شہید کر دیئے گئے۔ ان کی اہلیہ پر تلوار سے حملے ہوئے اور انھیں بھی دیگر شہدائے کرام کے درمیان پھینک دیا گیا۔ چودھری حمید اللہ اس وقت محاذ جنگ پر تھے۔ ان کے خلوص کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے خاندان کو پاکستان نہ لائے بلکہ اہل وطن کے درمیان ان کو رکھا اور خود مصروف جہاد رہے۔ چودھری حمید اللہ خان کے اہل و عیال کو ازراں بعد پاکستان پہنچایا گیا۔ چودھری صاحب نے مہاجرین کی آبادی کے لیے بڑا کام کیا اور مسلم کانفرنس سے وابستہ رہے مگر اس داخلی سیاست سے تعلق نہ چھوڑا اور چودھری غلام عباس کے ساتھ رہے۔ آپ کو ایک بار پھر آزاد جموں و کشمیر کا وزیر قانون بنایا گیا۔ ۱۹۵۶ء میں کراچی میں آل پارٹیز کشمیر کانفرنس میں معرکہ آرا تقریر کی۔ استصواب رائے عامہ کمیشن پاکستان کی طرف سے جو تقرر ہوا، آپ اس کے چیئر مین تھے۔ آپ نے آزاد حکومت کی وزارت قانون سے استعفیٰ دے دیا اور اس دور میں وکالت شروع کر دی۔ آپ خوب صورت، نیک سیرت، با کردار اور متمول ہونے کے باوجود عوامی انسان تھے۔ جموں اور کشمیر کے رہنے والوں کو آپ سے بے حد انس تھا۔ آپ نے ۱۹۳۴ء سے لے کر تادم واپس ہر ریاستی تحریک میں حصہ لیا۔ روٹی ایپی ٹیشن میں آپ نے اعلیٰ کردار ادا کیا اور جب ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کیا اور اکھنور میں شورش ہوئی تو آپ وہاں خود گئے اور حالات پر قابو پایا۔ آپ سیالکوٹ میں علیل ہوئے اور مشن ہسپتال پیرس روڈ میں آپریشن کے باعث دم توڑ گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون، اور یوں ریاستی عوام ایک ذہن و فطین قومی خدمت گار سے محروم ہو گئے۔

تھیں۔ لیکن میر واعظ محمد یوسف شاہ کا اصرار تھا کہ جیل جانے سے قبل چودھری غلام عباس نے انھیں یہ کام سونپنا تھا۔ بہر حال مسلم کانفرنس کے لیڈروں اور کارکنوں نے دونوں کو اہمیت دی۔ یہ وہ دور تھا کہ ریاست میں نیشنل کانفرنس نے تحریک ”کشمیر چھوڑ دو“ شروع کر رکھی تھی۔ مسلم کانفرنس نے بھی سول نافرمانی کی تحریک جاری کر کے مہاراجہ کشمیر کی حکومت کو لاکا رہا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ پاکستان بن رہا تھا اور ریاستوں کے معاملات ایک سنجیدہ اور سنگین صورت حال اختیار کر رہے تھے۔ ۳ جولائی ۱۹۴۷ء کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا اور ریاست میں مسلم کانفرنس نے ۱۹ جولائی ۱۹۴۷ء کو ریاست پاکستان کے ساتھ الحاق کی غیر مشروط قرارداد منظور کی۔ اس موقع پر چودھری حمید اللہ خان ریاست میں موجود تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم کانفرنس کی جانب سے چودھری حمید اللہ خان اور پروفیسر محمد اسحاق قریشی ہی قائد اعظم محمد علی جناح کو ملتے تھے اور ان سے ریاستی امور و مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے تھے۔ ۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم محمد علی جناح نے چودھری حمید اللہ خان اور پروفیسر محمد اسحاق قریشی سے ملاقات کے حوالے کے بعد جو بیان جاری کیا، اس میں فرمایا تھا کہ:

”کشمیری مسلمانوں کے ذہن اور توجہ پر چھا یا ہوا یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ آیا کشمیر پاکستان میں شامل ہو رہا ہے یا نہیں۔ میں ایک سے زیادہ مرتبہ واضح کر چکا ہوں کہ ہندوستانی ریاستیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں یا ہندوستان کے ساتھ یا خود مختار اور آزاد رہیں۔ اس میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ مہاراجہ اور حکومت کشمیر اس مسئلہ پر انتہائی توجہ اور خلوص نیت سے غور کریں گے اور صرف حکمران کے مفادات کو ملحوظ نہ رکھیں گے بلکہ اپنے عوام کے مفادات کا بھی خیال رکھیں گے۔ ہم پہلے بھی واضح الفاظ میں واضح کر چکے ہیں کہ ہم کسی ریاست کو مجبور نہ کریں گے۔ نہ ڈرائیں دھمکائیں گے، نہ کسی اور قسم کا دباؤ ڈالیں گے۔ ہر ریاست کو اپنی مرضی اور خوشی سے فیصلہ کرنا چاہیے۔ جو ریاستیں اپنی مرضی سے پاکستان میں شامل ہونا چاہیں گی وہ ہمیں خیر مقدم کے لیے مستعد اور باہمی مفاد کی خاطر معاہدے طے کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار پائیں گی۔ جو ریاستیں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار رہنا پسند کریں، گی ہم ان کی اس خواہش کا پورا احترام کریں گے اور باہمی اور دوطرفہ مفاد کی خاطر ان سے مفید اور اچھے اچھے معاہدے طے کریں گے۔“

انھی ایام میں چودھری حمید اللہ خان نے ریاست کے مخصوص حالات کو دیکھتے ہوئے اور مہاراجہ ہری سنگھ کے ریاست کو آزاد اور خود مختار رکھنے اور ریاستی وزیر اعظم پنڈت رام چند کا ک

کلام غالب میں طنز و مزاح کا عنصر

مولانا حالی نے اپنے نام وراستاد مرزا اسد اللہ خاں غالب کو حیوانِ ظریف کچھ غلط نہیں کہا۔ سرسری مطالعے کے بعد ہی پڑھنے والے کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ خطوطِ غالب ہوں یا کلامِ غالب، نثر و شعر کے دونوں میدانوں میں غالب نے طنز و مزاح کے اسلوب سے خوب خوب کام لیا ہے اور قدم قدم پر شگفتگی کے پھول کھلائے ہیں۔ دراصل غالب کے مزاج میں شوخی کا جو عنصر بطور خمیر قادرِ مطلق نے شامل کیا تھا، مرزا نے اسے اپنی تخلیقات میں اس خوبی سے منتقل کیا ہے کہ ان میں برجستگی، لطافت اور طرزِ ادا کی ندرت اُبھر آئی ہے۔ یوں تو ادبی حلقوں میں سب سے زیادہ لطیف، انشا اور مجاز سے منسوب کیے جاتے ہیں لیکن میر و اقبال جیسے عظیم شعرا کی صف میں غالب اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کی بہت سی روایات موصوف سے وابستہ کی جاتی ہیں جو اس امر کی غمازی کرتی ہیں کہ غالب کی فطرت میں شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔

کلامِ غالب میں مسائلِ تصوف، فلسفیانہ تصورات اور تجسس و تیرکی کی فضا نے نافتین کو اپنی طرف اس طرح متوجہ رکھا اور شارحین کلامِ غالب اشعار کی پہلو داری اور علاماتی پرتوں میں اتنے الجھے رہے کہ شعروں کی زیریں سطح اور بالائی پرت پر موجود شوخی کا عنصر خاطر خواہ توجہ کا مرکز نہیں بنا سکا اور نہ حقیقت یہ ہے کہ متداول دیوانِ غالب کا پہلا شعر بلکہ پہلا مصرع ہی شوخی تحریر کا حامل ہے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہاں، شوخی تحریر سے میری مراد اس لفظی ترکیب سے نہیں ہے جو شعر میں برتی گئی ہے بلکہ اس شوخ لب و لہجہ سے ہے جو غالب نے نقاشِ ازل کے تخلیقی عمل پر تبصرے کے لیے استعمال کیا ہے۔ آج سے تقریباً ایک سو پچاس برس پیش تر، جب معاشرہ، مذہب سے اس حد تک بیگانہ نہ ہوا تھا، جتنا کہ آج ہے، غالب خداے برتر سے مخاطبت کے دوران اکثر ایسا ہی شوخ و شنگ لہجہ اور انداز اختیار کرتے ہیں۔ چند بولتی ہوئی مثالیں ملاحظہ ہوں:

□

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود میں ہیں کہ ہم اُلٹے پھر آئے، در کعبہ اگر واسنہ ہوا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی ہمت

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

میری قسمت میں غم گراتا ہمت دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے شوخی کا یہ انداز کہ در کعبہ وانہ ہو تو حضرت غالب اُلٹے پھر آتے ہیں، فرشتوں کے لکھے پر بے اعتمادی کہ اس وقت ہمارا کوئی آدمی موجود نہ تھا، گناہ کا حساب دینے پر اس اعتراض کے ساتھ عذر خواہی کہ اس طرح خدا کے ودیعت کردہ داغِ حسرت دل یاد آجاتے ہیں اور پھر یہ مطالبہ کہ تقدیر میں اتنے غم لکھے تھے تو دل بھی بہت سے عطا کرنے تھے، کچھ غالب ہی پر پھبتا ہے کیوں کہ ایسے نازک مقامات پر عام فن کاروں کا تو دم پھول جاتا ہے۔

قدیم عقائد اور مذہبی روایات کے سلسلے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے بھی غالب کا لہجہ اکثر بے باک اور شوخ ہو جاتا ہے یوں تو عام طور پر زاہد کی ریاکاری اور شیخ کی نمائشی پارسائی پر فارسی وارد و کے غزل گو طعن و تشنیع کرتے ہی رہتے ہیں لیکن غالب اس راہ پر بہت آگے بڑھ کر اپنی شوخی اور ظریفانہ اندازِ گفتگو کے وسیلے سے قدیم عقائد پر وار کرتے نظر آتے ہیں۔ ذرا ان اشعار کے تیور دیکھیے:

بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیے مسجد کے زیر سایہ حسرا بات چاہیے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہو ہمیں بہشت عزیز سواے بادہ گل فام و مشک بو کیا ہے

کہاں میخانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ پراتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا ہمت کہ ہم نکلے

گوواں نہیں پہواں کے نکالے ہوئے تو ہیں کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی
 کل کے لیے کر آج نہ خست شراب میں یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں
 اور مذہبی امور میں شوخی کا یہ عنصر محض غزلوں تک محدود نہیں ہے، قطعہ و رباعی بھی اس کی زد
 میں ہیں:
 افطارِ صوم کی کچھ اگر دست گاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
 جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہیں روزہ اگر نہ کھائے تو ناحیہ کیا کرے
 اہل نظر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جو غالب مذہب اور محبوب حقیقی کے ساتھ ایسا کھلا شوخی آمیز
 رویہ اختیار کرتے ہیں وہ معشوق مجازی کے بارے میں ویسی مؤذبانہ خود سپردگی اختیار کرنے سے رہے
 جہاں غبارِ میر آس سے دُور بیٹھتا ہے، چناں چہ ارضی محبوب کے ساتھ غالب کی چہلمیں ملاحظہ ہوں:
 عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے سرا کام مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ سرے آگے
 لاغر اتنا ہوں کہ گرتو بزم میں حبادے مجھے مسیرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
 وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے تم نے کیوں سوچنی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
 اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے کہا جو اس نے، ذرا مرے پاؤں داب تو دے
 پھر کھلا ہے در عدالت ناز گرم بازارِ فوج داری ہے
 سیکھے ہیں مرنخوں کے لیے ہم مصوری تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے
 رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں
 دھول دھپے اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، کہ اٹھیں گے لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
 بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا التفات عنقا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر
 کتنے شیریں ہیں اُس کے لب کہ رقیب گالیاں کھاکے بے مسزاسہ ہوا
 لے تولوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ایسی باتوں سے وہ ظالم بدگماں ہو جائے گا
 ہر ایک بات سپ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے تمھی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
 بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں، ورنہ سب کیا خواب میں آ کر تہم ہائے پنہاں کا
 لیکن محبوب کے ساتھ چھیڑ خانی کرنے اور فقرے چسپاں کرنے کا یہ عمل یک طرفہ نہیں ہے۔
 کلام غالب کے آئینے میں اُن کا محبوب بھی اتنا ہی شوخ و شنگ، بذلہ سخ اور حاضر جواب ہے۔
 چناں چہ غالب کے ساتھ اس کی حرکتوں اور گفتگو میں شوخی و ظرافت کی پھلجھریاں چھوٹی دیکھی جاسکتی
 ہیں۔ ملاحظہ ہوں یہ دلچسپ محاکاتی اشعار:
 در پور ہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا جتنے عرصے میں سرا لپٹا ہوا بستر کھلا
 تب اہل پیشگی سے مدعا کیا کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
 داد دیتا ہے سرے زخمِ جگر کی، واہ واہ یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جانمک
 میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی عُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں
 پینس میں گزرتے ہیں وہ کوچے سے جو میرے کندھے بھی کہاوں کو بدلنے نہیں دیتے
 نکلنا خلد سے آدم کا سننے آئے ہیں لیکن بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

طنز و ظرافت اور شوخی و حاضر جوابی دو دھاری تلواریں ہیں جن کا وارمہ مقابل کے ساتھ خود اپنے آپ پر بھی پڑتا رہتا ہے۔ اُس روایتی پیرزن کی مانند جسے کوئی جھگڑنے کو نہیں ملتا تو ہوا سے تکرار کرتی ہے، غالب سبھی محبوب اور رقیب کے ساتھ خود اپنی ذات کا مضحکہ اڑاتے ہیں اور اکشر اپنے بارے میں ایسے پُر لطف اعترافات کرتے ہیں:

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اترانا
وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پے بدن نام بہت ہے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

عشق نے غالب نکلنا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

دے وہ جس قدر، ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

اُگا ہے گھر میں ہر سوسزہ، ویرانی تماشا کر
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے، ہے میر گدباں کا
کار و بار عشق میں شوریدگی کے ہاتھوں غالب جو مضحکہ خیز حرکتیں کرتے ہیں، ان کی دل چسپ تصویریں بھی اپنے اشعار میں محفوظ کر دیتے ہیں۔ ایسے چند تمسخر آمیز اور شوخ لفظی مرتعے آپ بھی دیکھیں:

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ
یارب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

خدا کے واسطے داد اس جنون شوق کو دینا
کہ اُس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر مسلم نکلے

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تم ساشے اہل کرم دیکھتے ہیں
اور شوخی کی یہ لے کہیں اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ غالب مرثیہ عارف لکھتے ہوئے بھی اپنے جذبے کی شوخی پر قابو نہیں رکھ پاتے اور کہتے ہیں:

تم ایسے کھرے بھی تو نہ تھے داد و ستد کے

کر تا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

البتہ ایسے بے شمار اشعار کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ غالب محض ایک ظریف شاعر اور شوخ لہجہ رکھنے والے غزل گو تھے کیوں کہ یہ ان کے پہلو دار اسلوب کا ایک رخ ہے، مکمل اسلوب نہیں۔ غالب نے شاید ایسے ہی مواقع سے بچنے کے لیے کہا ہے:

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد
کھلا کہ فائدہ عرض ہنر میں خاک نہیں

حمیرا حیات، دہلی

اردو کی غیر روایتی تانیٹی آواز: فہمیدہ ریاض

اردو ادب کے افق کا ایک اور ستارہ دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا ۲۸ جولائی ۱۹۴۵ء کو ہندوستان کی سرزمین شہر میرٹھ کے ادبی خاندان میں پیدا ہونے والی شاعرہ فہمیدہ ریاض جن کا خاندان قیام پاکستان کے بعد ہمیشہ کے لیے لاہور منتقل ہو گیا تھا، ۲۲ نومبر ۲۰۱۸ء کو مختصر علالت کے بعد لاہور میں سپرد خاک ہوئیں۔ ۴۲ سال کی عمر میں سر سے والد کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ان کی پرورش والدہ کے زیر اثر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کراچی میں حاصل کی اور سندھ یونیورسٹی سے گریجویشن پاس کیا۔

ادبی دنیا میں فہمیدہ ریاض کی شناخت بطور شاعرہ بالخصوص ایک نظم نگار ہوتی ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہیں اور شاعری کے علاوہ فکشن اور ترجمہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ شاعری و نثر میں ان کی کم و بیش ۱۵ کتابیں اور کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کا شوق انھیں طالب علمی کے زمانے سے تھا لہذا ان کی پہلی نظم احمد ندیم قاسمی کے رسالہ ”فنون“ میں شائع ہوئی اور پہلا شعری مجموعہ ”پتھر کی زبان“ محض ۲۲ برس کی عمر میں ۱۹۶۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد مجموعہ ”بدن دریدہ“ آیا جس پر انھیں سخت نکتہ چینی کا سامنا بھی کرنا پڑا پھر دھوپ، ”کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟“ ”ہم کاب“ اور ”آدمی کی زندگی“ بالترتیب شائع ہوئے۔ ان کا کلیات پہلے ”میں مٹی کی مورت ہوں“ ۱۹۸۸ء اور پھر ”لب لعل و گہر“ کے عنوان سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا۔ ”زندہ بہار“، ”گوداوری“ اور ”کراچی“ ان کے ناول ہیں۔ علاوہ ازیں فارسی زبان کے شاعر رومی اور سندھ زبان کے نامور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی اور شیخ ایاز کے کلام کے تراجم بھی کیے۔ (فارسی کی معروف شاعرہ فروغ فرخ زاد کے اردو تراجم بھی ان سے یادگار ہیں۔)

تصنیف و تالیف کے علاوہ فہمیدہ ریاض کو سماجی کاموں اور سیاست میں بھی کافی دلچسپی تھی لہذا پاکستان میں جمہوریت اور حقوق نسواں کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتی تھیں۔ جمہوریت کی خاطر انھیں جنرل ضیاء الحق کے عہد حکومت میں پاکستان بھی چھوڑنا پڑا۔ جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، آخر کار جلا وطنی اختیار کر کے امرت پریتم کی حکومت ہند سے درخواست کرنے پر فہمیدہ ریاض ہندوستان آ گئیں اور عہد جلا وطنی ہندوستان ہی میں گزارا۔ ضیاء الحق کے انتقال کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے پاکستان لوٹ آئیں۔ فہمیدہ ریاض کئی اہم عہدوں پر بھی فائز رہیں۔ وہ ۲۰۰۹ء میں دو سال کے لیے اردو ڈکٹری بورڈ (کراچی) کی چیف ایڈیٹر مقرر ہوئی اور اسلام آباد نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سربراہ بھی

رہیں۔ حکومت پاکستان نے انھیں خدمت خلق و ادب کے لیے متعدد انعامات سے نوازا۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں ۲۰۱۰ء میں صدر قریب ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز، ۲۰۰۵ء میں المفتاح ایوارڈ برائے ادب و شاعری اور شیخ ایاز ایوارڈ، سماجی و سیاسی کاموں کے لیے ۲۰۱۷ء میں ہیومن رائٹس واچ کی جانب سے ہیمن ایوارڈ برائے ادب دیا گیا۔

آئیے اب اس نسا ئی ادب کے خوب صورت استعارے یعنی فہمیدہ ریاض کی شاعری کے حوالے سے ان گوشوں کو اجاگر کریں جو ان کو ہم عصر شاعرات سے منفرد کرتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض نے جب شاعری کا آغاز کیا تو ترقی پسند تحریک کی لہرواں دواں تھی۔ ان کی ہم عصر شاعرات میں ادا جعفری، زہرا نگاہ، شبنم شکیل اور پروین شاکر قابل ذکر ہیں۔ تقریباً ان سبھی شاعرات نے بالخصوص غزل پر توجہ دی، لیکن فہمیدہ ریاض نے اپنی الگ ڈگر چنی اور نظم معر اور آزاد نظم کو اپنے احساسات و جذبات کا وسیلہ اظہار بنایا۔ لہذا اپنی منفرد تانیٹی آواز، غیر روایتی خیالات اور شعری انفرادیت کے سبب بہت جلد ادبی دنیا میں مقبول ہو گئیں۔

دراصل فہمیدہ ریاض ایک نظریاتی شاعرہ تھیں۔ ان کا اپنا ایک منفرد نظریہ تھا جس میں انقلابی خیالات کی روش تھی۔ وہ ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھنے والی خاتون تھیں جہاں انسان کو انسان کے جبر سے رہائی حاصل ہو، خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو۔ انسان کی غلامی سے انھیں نفرت تھی۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اقتصادی، ذہنی، اخلاقی، زمینی اور جسمانی تجرباتی مسائل کو اولیت دی اس لیے ان کے تصورات و خیالات میں بتدریج ارتقا نظر آتا ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ”پتھر کی زبان“ میں ہمیں ایک رومانی کرب کی کیفیت نظر آتی ہے، ایک ایسا کرب جس میں عورت کا وجود نرم و نازک احساسات و محبت اور اپنی پوری رنگینی و حسیاتی نزاکتوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ مثلاً:

سچائی، الفت، خودداری / مٹی کے کمزور کھلونے

ایسی مقدس جیسے مریم / ایسی اجلی جیسے جھوٹ

عورت اور جنس تقریباً ہر شاعرہ کے کلام کا موضوع رہا ہے اور شاید یہ تقاضاے وقت بھی تھا، لہذا فہمیدہ نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا۔ لیکن ان کی شاعری میں یہ موضوع مختلف انداز میں پیش ہوا ہے۔ انھوں نے جنسی تجربے کو ایک مابعد الطبیعیاتی جہت کے ساتھ منسلک کیا ہے جو ان کے لفظوں میں کھل کر نمایاں ہوا ہے۔ ان کے لفظیات میں حسیاتی شدت بہت اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً:

یہ کیسی لذت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا / یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو جھل

یہ کیف کیا ہے کہ سانس رک رک کے آ رہا ہے / یہ چھوٹی نبض، رکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی

گلاب و کافور کی لپٹ تیز ہو گئی ہے / یہ آنسوئی بدن، یہ بازو، کشادہ سینہ

مرے لہو میں سمٹتا سیال ایک نکتے پہ آ گیا ہے

ان کے کلام کی خاصیت یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری میں ہندی اسطیسرا کا اثر بہت نمایاں ہے۔ ہندی زبان سے وہ اچھی طرح واقف تھیں۔ ہندوستان میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ہندی زبان و ادب سے قریب رہیں۔ باقاعدہ ہندی زبان سیکھی جس کا اثر ان کی شاعری پر پڑنا لازمی تھا۔ مثلاً:

کیسی برکھا برس رہی ہے/ اس برکھا کے امرت رس سے
بھیک چکی میں بھیک چکی میں/ لکتی پچھتی دھوپ اور بادل
یہ آکاش کے ننھے بالک/ اھیل رہے ہیں ہنسنے ہنسنے

عورت کے وجود کو کائنات اور فطرت سے مدغم کر کے انھوں نے شاعری کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا اور اسے ایسی وسعت بخشی جو معاشرتی بندھنوں میں اسیر اور روایات کی پابند عورت سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی شاعری صرف جنس تک محدود نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بھی بہت کچھ ہے۔ یہ عورت ان کی شاعری میں اکثر و بیش تر باغیانہ انداز میں نہ صرف اپنے وجود بلکہ انسانی حقوق کی پاس داری کرتی ہے اور ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ باوجود اس کے ان کی شاعری نعرے بازی کی صورت اختیار نہیں کرتی، شور نہیں مچاتی بلکہ دھیمے لہجے میں کڑوی سچائیاں کہنے کا ہنر آزماتی ہیں۔ فہمیدہ فکری لحاظ سے مارکسٹ تھیں۔ وہ اصلاحی، معاشرتی اور سیاسی تحریکوں سے بھی وابستہ رہیں لہذا ان کے کلام میں معاشرے کے خلاف ایک احتجاج ملتا ہے۔ اس احتجاج کا مقصد نئے معاشرے کی تشکیل کرنا ہے۔ دراصل وہ ایسے معاشرہ و نظام کی خواہش مند ہیں جو مساوات اور عدل و انصاف پر مبنی غریب، پس ماندہ طبقے، کسان، مزدور کے حقوق کی علم بردار ہیں۔ فہمیدہ سیاست کو زندگی سے جدا نہیں کرتی کیوں کہ وہ ترقی پسند شاعرہ تھیں اور اس وقت ترقی پسند ادب کا تقاضا بھی تھا۔ وہ سیاست کو زندگی سے الگ نہیں بلکہ اس کا بنیادی جز سمجھتی ہیں اور تخلیق فن سے اس کا گہرا ربط پیش نظر رکھتی ہیں۔ وہ ایک قلم کار کو اپنے ارد گرد کے سیاسی، سماجی، اقتصادی ماحول سے باخبر رہنا اور اپنی تخلیق میں دنیا کے سامنے رکھنا اہم فریضہ سمجھتی ہیں۔ وہ تغیر پر یقین رکھتی ہیں اور اس بدلاؤ کے لیے وہ حوصلہ و ہمت دینے کی سعی کرتی ہیں تاکہ معاشرے میں مثبت تبدیلیاں آئیں۔ اس میں شک نہیں ان کی شاعری کا آہنگ انقلابی ہے مگر دوسرے ترقی پسند شعرا کی طرح ان کے ہاں نعرہ بازی قطعاً نہیں۔ ان کی نظم ساحل کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

اتنا گنم اتنا تنہا/ بے خانماں سا یہ ایک بچہ/ جس کا کوئی گھر کہیں نہیں ہے
جس کی وارث زمیں نہیں ہے/ جیسے جھوٹی غذا کا دونا

□

ساحل پہ کہیں پڑا ہوا ہے/ جیسے گیلی ہوا کی زد میں/ میلے کاغذ کا ایک ٹکڑا
معاشی وسائل پر ناجائز قبضہ کرنے والوں کے خلاف ڈٹ جانے کا حوصلہ ان کی شاعری میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ اپنی شاعری کے ذریعے وہ مفلس اور فاقہ کش کسان و مزدور کو یاد دلاتی ہیں کہ یہ غربت اور پس ماندگی ان کا مقدر نہیں ہے، ان کی محنت کا پھل انھی کو ملنا چاہیے، کوئی دوسرا اس پھل کو کھانے کا حق دار نہیں ہے۔ مثلاً:

وہ دھرتی جو سدھتھاری سیوا کرتی جائے/ سر پر ہاتھ دھرو گے تم بیٹھی ہے آس لگائے
دن ڈوبا، ہل پاس کھڑا ہے، دیکھو یہ انیائے/ اس کی کوکھ میں بیج تمھارا، دو جا کیوں پھل پائے
یہ ہی ماتا، یہی ہے پتی، یہی تمھاری بیٹی/ پاس وڈیروں کے مت چھوڑو بڑی اداس رہے گی
فہمیدہ کی شاعری میں زمینی محبت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں ان کے پرکھوں نے زندگیاں گزاریں اور پیوند خاک ہوئے، اس سر زمین سے بہت زیادہ وابستگی محسوس کرتی ہیں۔ اس زمین کے کلچر، وہاں کی روایات سے بھی محبت کرتی ہیں۔ دراصل جو وقت انھوں نے (از خود) جلاوطنی کے دوران ہندوستان میں بتایا، اس کے نقش ان کی شاعری میں صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مہاجر کا تشخص بڑا پائیدار اور مضبوط ہے۔ وہ اپنے ماضی میں خود کو بہت مطمئن محسوس کرتا ہے۔ حال کی زمین اس کے لیے بڑی الجھنوں کا مسکن ہے۔ نظم مہاجر کی چند سطریں ملاحظہ ہوں:

یہ نیلے نیلے غبارے/ خود اپنے زور سے پھوٹ گئے

نانا ندیش کی بلندی سے/ دھجیاں، ربرٹ کی مردہ کھال کی طرح گریں

کس تیزی سے/ بے جان ربرٹ کے یہ ٹکڑے/ کس سمت ٹھکانہ پائیں گے

ان کی کلام کی انفرادیت کی ایک اور جہت متنا کارنگ ہے۔ بچے اور متان کا مستقل موضوع ہے جس کا ثبوت ان کے کلام میں موجود لوریاں ہیں۔ متنا کا موضوع کوئی نیا موضوع نہیں ہے اور یہ شاعرانہ مشترک موضوع بھی رہا ہے مگر فہمیدہ ریاض کے یہاں یہ موضوع الگ اور نئی سوچ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ لوریاں بچوں کو خواہیدہ زندگی گزارنے کا درس نہیں دیتیں اور نہ ہی لفظوں کا میٹھارس گول کر دینا سے غافل کرتی ہیں بلکہ نیند سے جگا کر زندگی کی حقیقتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ جب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتی ہیں تو وہ اپنی بیٹی کو زمانے سے مصالحت کا درس نہیں دیتیں بلکہ مخالف حالات سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتی ہیں کیوں کہ وہ عورت کو بزدل نہیں دیکھنا چاہتیں۔ وہ اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ زندہ رہنے کا درس دیتی ہیں۔ انسانی اقدار و احترام کی تربیت دیتی ہیں۔ مثلاً:

بھیڑے سے نہیں ڈرنا/ میری جان جم کے لڑنا

یادنامہ علی اصغر عباس

سید حامد یزدانی

علی اصغر عباس: خلوص اور دوستی کا شفاف آئینہ

سید حامد یزدانی کی یہ تحریر گزشتہ شمارے کے ”گوشہ علی اصغر عباس“ کے لیے اگرچہ بروقت موصول ہو چکی تھی مگر سہو نظر سے شامل اشاعت نہ ہو سکی، سو، یہاں اس کی اشاعت گزشتہ شمارے کے متذکرہ حصے کا تسلسل تصور کیا جائے۔ (ادارہ)

میری ادبی زندگی کے سفر کا ایک اہم موڑ پاک ٹی ہاؤس سے آغاز ہے اور اس موڑ پر مستقبل کے جن ہم سفر سے آشنائی ہوئی ان میں علی اصغر عباس کا نام یقیناً نمایاں تر ہے۔ یوں تو ایک بار پہلے بھی میرا ٹی ہاؤس جانا ہوا تھا۔ جناب شہرت بخاری اور جناب انجم رومانی کو ایک مشاعرہ میں مدعو کرنے کی غرض سے۔ مگر بس کھڑے کھڑے ہی سلام دعا اور بات چیت ہوئی۔ تب میں بس ایک اچھی سی نظر ہی اس بھر پور منظر پر ڈال سکا تھا جس میں مختلف میزوں پر نام ور لکھاری باہم ہم کلام تھے۔ یہ میرا ٹی ہاؤس سے تعارف تھا تاہم اس سے میری باقاعدہ ملاقات کا سبب خوب صورت ادیب دوست وسیم گوہر بنا جو میرا محلہ دار تھا اور بڑے بھائی ساجد یزدانی صاحب کا دوست بھی۔ اس کا عمران سیریز میں ایک جاسوسی ناول ”ڈاکٹر کاربنکل کی واپسی“ اشاعت پزیر ہو چکا تھا تاہم ان دنوں وہ سنجیدہ ادب کی طرف راغب تھا۔ اسی کے اصرار پر اور اسی کے ساتھ میں ایک شام ”باقاعدہ“ پاک ٹی ہاؤس پہنچا۔ وہی ”دھواں دھار“ اور بھر پور منظر پھر ننگا ہوں کے سامنے تھا۔ وسیم گوہر اپنی طبعی بے تکلفی اور ملن ساری کے ساتھ مسکراہٹیں بکھیرتا اور مجھے بازو سے تقریباً کھینچتے ہوئے سیدھا آخری میز تک لے گیا جہاں اسرار زیدی صاحب اپنے مجتہدین کے جلو میں تشریف فرما تھے۔ ان سے تعارفی علیک سلیک کے بعد وہ مرکزی ستون کے ساتھ سچے میز پر لے گیا۔ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بولا: ”وہ بزرگوں کی جگہ تھی یہ جو جوانوں کا میز ہے“ اور پھر وہاں موجود جوانوں سے تعارفی سلسلہ ہوا۔ اظہر غوری کے ساتھ اسماعیل عاطف بیٹھے تھے۔ ایک کرسی پر ایک افسانہ نگار صاحب تھے اور ان کے ساتھ بیٹھا تھا جھنگ (اور فیصل آباد) سے نو وارد نوجوان شاعر علی اصغر عباس۔ تبادلہ خیالات کا اگلا مرحلہ ”تبادلہ غزلیات“ تھا۔ علی اصغر عباس کی شاعری اور شخصیت کا سحر کام کر رہا تھا۔ اس کی

کبھی مت ہونا نراس / ویرتا سکھاؤں تجھ کو
شیرنی بناؤں تجھ کو / ڈرنہ پھٹکے پاس
سن میری ننھی نیلی / نہیں ہوگی تو اکیلی
سنگ ہو گئے بانہہ نیلی / تیرے سنگی تیرے میت
تیرے ساتھ ساتھ ہوں گے / ہاتھ میں کئی ہاتھ ہوں گے
یہی ہے میری اک آس

ان کی شاعری میں ہمیں عورت کا انوکھا روپ نظر آتا ہے۔ ایک ایسی عورت جو روایت سے ہٹ کر چلنے پر یقین رکھتی ہے جو تغیر کو پسند کرتی ہے۔ ایک ایسی عورت جو نظام اور اس کے ارتقا میں ایک گہرا شعور رکھتی ہے اور اپنے وجود کو فطری اور غیر مصنوعی صورت میں پہچاننے کی سعی کر رہی ہے۔ وہ عصری آگے رکھنے والی فعال عورت کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ ان کے یہاں گھٹے ہوئے فرسودہ ماحول اور جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج کرتا ہوا نظریاتی پہلو سامنے آتا ہے جس کی عمدہ مثال ان کی نظم ”کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے“ میں واضح ہوتا ہے۔ یہ ایک طویل نثری نظم ہے جس میں ایسا غم نہیں ہے جہاں دبے کچلے عوام، فاقہ کش، مفلس کو زندگی کا حق حاصل کرنے کا حوصلہ موجود ہے۔ یہاں فہمیدہ ریاض عورت کا نیاروپ لے کر سامنے آتی ہیں جو صرف نسائی مسائل تک محدود نہیں بلکہ پورے معاشرے کے دکھوں کو اپنے احساسات میں لپیٹے ہوئے حساس فرد ہونے کے ناتے اچھائی برائی کا شدید احساس رکھتی ہے۔ جو انسانی اور قومی مسائل کو اولین اہمیت دیتی ہے۔ مثلاً:

ممکن تو یہی ہے باغبان / ہزار گلابوں کا چمن کھلے

بارش کی بو چھار میں / ایک شاخچہ بھی تشنہ نہ رہے
میں اسی دن کے لیے گاتی ہوں / گاتی رہوں گی

ہر آخری گیت، امید کا گیت / یہ شاعر کے دل کا فرمان ہے

مختصر یہ کہ فہمیدہ ریاض نے منفرد موضوع و لب و لہجہ کے ذریعے اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا ہے۔ وہ پاکستان کی پہلی شاعرہ تھیں جنہوں نے بلا خوف تحریک آزادی نسواں اور ترقی پسند تحریک کے امتزاج کو شاعری میں پیش کیا، جس کے سبب ان کے تخلیقی اور سیاسی خیالات پر دشنام طرازی اور بارش سنگ ہوتی رہی مگر اس باحوصلہ خاتون نے اپنے عزم سے قدم پیچھے نہیں کیے اور اپنا تخلیقی سفر ہر حال میں جاری رکھا۔ آج یہ باحوصلہ شاعرہ ہمارے درمیان نہیں رہی لیکن اس کی شاعری ہر دور میں زندہ ہوگی اور ہمارے ذہنوں کو جھنجھوڑتی رہے گی۔

دل چسپ باتیں اور دل کش غزلیں سب کی توجہ اپنی طرف مرکوز کیے ہوئے تھیں۔ یہ پہلی ملاقات اتنی زبردست تھی کہ اس کی بنیاد پر مستقل دوستی کا خواب استوار کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ خواب تعبیر آشنا ہو گیا۔ جملہ دوستی میں داخلہ اخلاص کے دروازے ہی سے ممکن ہے اور اخلاص اپنے خالص پن اور مخلصی دونوں رنگوں میں علی اصغر عباس کے پیکر میں مجسم تھا۔

میں کیا سبھی دوست قائل تھے کہ علی اصغر عباس ایک سچا دوست اور سچا شاعر ہے۔ دوستوں پر جان چھڑکنے والا اور شاعری میں اپنا دل اتار کر رکھ دینے والا کھرا تخلیق کار۔ اسی کی وساطت سے جہاں ان کے محترم والد صاحب، اس کے شاعر اور صحافی بھائیوں جناب نذیر ناجی، جناب علی اکبر عباس اور رضا سہیل سے تعارف ہوا، وہیں جاوید انور سمیت کتنے ہی عمدہ مشاعروں سے بھی پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ ملاقاتوں کی صورت ممکن ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چھوٹا سا کارواں تشکیل پا گیا تھا جس میں عباس تابش، ناہید شاہد، جاوید انور، اصغر عابد، راحت سرحدی، اعجاز رضوی، مختار حسین کھرل ہم قدم و ہم نوا ٹھہرے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس میں ادبی مباحث کا ”کوٹہ“ ختم کر کے، حلقہ ارباب ذوق کے تنقیدی اجلاس میں اپنا رنگ جما کر یہ کارواں چیمینز لٹیج ہوم، پرنس ریٹورنٹ، مال (روڈ) کی گرین ہیلٹ، پرانی انارکلی، ایم او کالج سے ملحقہ کینیٹین، ریواز گارڈن، دیوساج روڈ اور جانے کہاں کہاں پڑاؤ کرتا۔ بس شام کی شام اور پھر روانہ ہو جاتا۔ ایک اُن جان تخلیقی منزل کی جانب اس احساس اور سوچ سے بے پروا اور ماورا کہ اس کارواں میں امیر کون ہے، مسافر کون۔

رات گئے ایک ایک کر کے جب شہر کے سبھی ٹھکانے اپنی بساط لپیٹ لیتے تو علی اصغر عباس کے گھر کی وسیع چھت گویا اپنے بازو ہمارے لیے وا کر دیتی۔ اور ایک بار پھر دل نشیں قصوں، رنگارنگ تذکروں، تازہ تازہ شعروں اور بے دھڑک تہقہوں کا سلسلہ بحال ہو جاتا۔ کبھی کبھی جب میں اور علی اصغر عباس گپ شپ میں مصروف ہوتے اور رضا سہیل ادھر آنکلتا تو بے اختیار مسکرا دیتا۔ کہتا: ”اچھا تو ہنسوں کا جوڑا یہاں بیٹھا ہے“ اور پھر چائے کی یاد دہانی کروا تے ہوئے سیڑھیاں اتر جاتا۔ علی اصغر عباس کو اپنے والد صاحب اور اپنے بھائیوں سے بے حد محبت ہے اور ان کی نسبت سے ان کے اہل خانہ سے بھی۔ اپنی باتوں میں وہ نذیر ناجی صاحب اور علی اکبر عباس صاحب کا ذکر تو لازمی کیا کرتا۔ علی اکبر عباس صاحب کے ساتھ بیٹے دن، بھابھی صاحبہ کی باتیں، اپنے بچپن اور لڑکپن کی شرا تیں اور پھر پنجاب میڈیکل کالج میں اپنے پرانے اور ”لنگوٹیا“ یاروں کے ساتھ گزرے زندگی کے قابل ذکر اور ”نا قابل ذکر“ دل چسپ لمحات کا تذکرہ اس کی گفتگو میں ضرور شامل ہوتا۔ علی اکبر عباس صاحب کا شعری مجموعہ ”برآب نیل“ مجھے اسی کے وسیلے سے ملا تھا۔ کیسے بھول سکتا ہوں کہ

ایک بار پی ٹی وی اسلام آباد میں حالات حاضرہ کے شعبے میں ملازمت کے لیے اس نے نہ صرف مجھے نذیر ناجی صاحب سے سفارشی رقعہ لکھوا کر دیا تھا بلکہ لاہور سے اسلام آباد تک سفر کا ”جیب خرچ“ بھی زبردستی میری جیب میں ڈال دیا تھا۔

ہم نے اُن گنت مشاعرے مل کر پڑھے۔ لاہور میں بھی اور لاہور سے باہر بھی۔ اس ضمن میں شہر قصور کی انتظامیہ کی طرف سے منعقدہ مشاعرے کا سفر مجھے اب بھی یاد ہے۔ اس سفر میں جناب قائم نقوی بھی ہمارے ساتھ تھے جو سینئر ہونے کے باوجود ہم سب نئے لکھنے والوں سے بے تکلف تھے اور بہت محبت سے ہماری ہمت افزائی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے بی اے کا امتحان پاس کیا تو یونس حسرت امرتسری صاحب نے رفیع الدین رفیع ذکی قریشی صاحب کے ہاں میرے اعزاز میں ایک خصوصی شعری نشست بپائی تھی جس کی صدارت قائم نقوی صاحب کی تھی۔ مہمان شاعر اسلم کولسری صاحب تھے اور نظامت کی ذمہ داری علی اصغر عباس نے بہت محبت سے نبھائی تھی۔ اور پھر جرمی سے واپسی پر شیزان لاہور میں میرے اولین مجموعہ ”ابھی اک خواب رہتا ہے“ کی تقریب منعقد ہوئی تو اس میں بھی میرے دوست علی اصغر عباس نے اظہارِ خیال کیا۔ اس تقریب کے صدر شہزاد احمد صاحب تھے۔

مجھے علی اصغر عباس کے ساتھ ریڈیو پاکستان لاہور کے کئی یادگار مشاعروں اور ادبی پروگراموں میں بھی شرکت کا موقع ملا جن میں جناب احمد ندیم قاسمی، جناب یزدانی جالندھری، پروفیسر شہرت بخاری، پروفیسر انجم رومانی، پروفیسر عارف عبدالمتین، جناب شہزاد احمد، جناب خالد احمد، جناب نجیب احمد، پروفیسر اسلم طارق، پروفیسر عباس نجمی، پروفیسر حقیل روبی، پروفیسر صابر لودھی، جناب اسلم کولسری، پروفیسر آفتاب نقوی کے ساتھ ساتھ خالد علیم، ناہید شاہد، مختار حسین کھرل، اقبال نواز، علی اصغر عباس، عباس تابش، طاہر اسلم گورا، یونس بٹ، ضیا الحسن، حمیدہ شاہین، طارق کامران، اعجاز رضوی، اصغر عابد، عمران نقوی جیسے نوجوان لکھنے والے بھی شریک ہوئے تھے۔ ریڈیو کے ان ادبی پروگراموں کے روح و رواں نہایت اعلیٰ کہانی کار اور ہمارے بہت مہربان دوست جناب ارشاد حسین ہوتے تھے جنھیں ہم سب پیار سے ارشاد بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔ علی اصغر عباس اور میں تو ریڈیو سے ہٹ کر بھی ارشاد بھائی کی قربتوں سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان دنوں ریڈیو بھی جیسے ایک اہم ادبی مرکز بن گیا تھا۔

ریڈیو کے علاوہ ایک اور اہم ادبی مرکز ۴ میکلوڈ روڈ پر واقع رسالہ ”فنون“ کا دفتر تھا جہاں جناب احمد ندیم قاسمی کی شفیق توجہ کے سائے میں سر شام ہی ادبی دوست جمع ہونا شروع ہو جاتے

تھے۔ مجھے اس غیر رسمی محفل میں متعارف کروانے کا سہرا تو شاعر دوست عباس تابش کے سر ہے مگر علی اصغر عباس یہاں بھی ہم سب دوستوں کا ہم قدم وہم نفس رہا۔ یہاں عبداللہ قریشی صاحب جیسی بزرگ ہستیوں سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوتا اور جناب خالد احمد، نجیب احمد، منصورہ احمد صاحبہ، جناب اشرف جاوید، جاوید انور اور کتنے ہی اور اچھے شاعروں ادیبوں سے ملاقاتوں کی بھی صورت نکل آتی۔ یہاں گفتگو میں احمد ندیم قاسمی صاحب کے علاوہ اگر کوئی بول سکتا تھا تو وہ خالد احمد صاحب تھے جن کی شاعری، شخصیت اور گفتگو میں لاجواب تھیں۔ خالد احمد صاحب کا کلام تو کئی مشاعروں میں سُن چکا تھا تاہم ان سے بہ حیثیت شاعر میر تعارف۔ چوہدری گارڈنز میں منعقدہ ایک مشاعرے میں ہوا تھا۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی صدارت میں ہونے والے اس مشاعرہ کا اہتمام رشید کامل صاحب اور ان کے احباب نے کیا تھا اور انھوں نے والد صاحب (محترم یزدانی جالندھری) کے ساتھ مجھے بھی مدعو کیا تھا۔ جناب خالد احمد سے تجدید تعارف کا اعزاز مجھے بہت دنوں بعد علی اصغر عباس کے ذریعے حاصل ہوا۔ ایک روز وہ مجھے واہاؤس لے گیا جہاں خالد احمد صاحب کے ساتھ ساتھ جناب حفیظ تائب، جناب خالد صدیقی، جناب افتخار مجاز اور جناب رضا الحق صدیقی سے بھی ملاقات ہوئی۔ خالد احمد صاحب سے ملاقاتوں میں تسلسل بعد ازاں عباس تابش کی رفاقت میں آیا۔ ایک روز گھومتے پھرتے علی اصغر عباس اور میں ایم او کالج جانکے وہاں عطا الحق قاسمی صاحب، امجد اسلام امجد صاحب، یونس احقر صاحب، خالد بزیمی صاحب اور تحسین فراقی صاحب سے تادیر ملاقات رہی۔ عطا صاحب کے کاٹ دار فترے اور امجد صاحب کی پی ٹی وی کے ابتدائی دنوں کے حوالے سے گفتگو اب بھی میری یادداشت میں محفوظ ہے۔

حلقہ ارباب ذوق لاہور میں سیکریٹری ناہید شاہد کے ساتھ علی اصغر عباس نے بطور جاسٹ سیکریٹری جو فعال اور تعمیری کردار ادا کیا اس نے حلقے میں ایک بار پھر جان ڈال دی تھی اور اسی نوجوان کی ادبی قیادت کے دور میں مجھ سمیت متعدد نئے لکھنے والوں کو حلقے کی رکنیت ملی تھی۔ یہی نہیں اگلے ہی سال میری طبعی جھجک اور کچھ دوسرے تحفظات کے باوجود علی اصغر عباس نے میرا نام حلقے کے انتخابات میں بطور جاسٹ سیکریٹری تجویز کر دیا۔ اس اقدام کی تائید عباس تابش نے کی تھی۔ اس نے دوستوں کے ساتھ مل کر ایسی زبردست انتخابی مہم چلائی کہ فضا میں ایک ہل چل سی پیدا کر کے رکھ دی۔ اس سال سیکریٹری کے عہدے کے لیے پروفیسر سعادت سعید صاحب کو آمادہ کرنا بھی کوئی مہم سر کرنے سے کم نہ تھا۔

انتخابی نتائج سے قطع نظر اس انتخابی مہم کے سلسلے میں جتنے ادیبوں شاعروں سے ملنے کا مجھے موقع ملا وہ از خود ایک ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ علی اصغر عباس اور ہم سبھی دوست اس زمانے میں

حلقہ ارباب ذوق (مرکز)، حلقہ تصنیف ادب، حلقہ ادب اور پنجابی ادبی سنگت اور پنجابی ادبی پریا کے ہفتہ وار اجلاسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ مجھے یاد آیا، علی اصغر عباس بطور منتظم کچھ عرصہ حلقہ ارباب غالب اور قلم قبیلہ کے لیے بھی سرگرم عمل رہا۔ مجھے اپنے زمانہ طالب علمی کے وہ دن نہیں بھولتے جب اصغر ابھی سیٹ بنک سے منسلک نہیں ہوا تھا، وہ اکثر گورنمنٹ کالج لاہور آجاتا۔ یہاں مجھ سے بھی ملاقات ہوجاتی اور کالج کے تخلیق کار اساتذہ اور راویز کے ساتھ بھی ملنے کا موقع مل جاتا۔ میں کلاس سے فارغ ہو کر کیفیئر یا پینچا تو علی اصغر عباس کو بے شکن سوٹ بوٹ میں ملبوس افضال نوید اور دوسرے دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتے ہوئے پاتا۔ اس کے زندگی افریقہ، بے لاگ تبصرے اور دل آویز قصے محفل کو گرمائے ہوتے تھے۔ ان دنوں اس نے گورنمنٹ کالج لاہور کی ادبی تنظیموں خاص کر مجلس اقبال اور پنجابی مجلس کے متعدد اجلاسوں کی کامیاب صدارت بھی کی۔ علی اصغر عباس دوست بنانے کا فن جانتا ہے مگر دوستی کے لیے اس کا معیار بہت کڑا ہے۔ اور جب کوئی اس کا دوست بن جاتا ہے تو وہ اس کے خوب ناز اٹھاتا ہے۔ دوستی کے خُسن کو بہت محبت سے نکھارتا ہے۔ دوست کو آسنہ بنا کر سامنے رکھ لیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں بس خود ہی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنے جیسی وارفتگی اور خلوص کا متقاضی ہوتا ہے اور اس آسنے میں اسے ذرا سابل بھی سخت ناگوار گزرتا ہے۔ ایسا ہوجانے تو بھی بس کچھ روز وہ خود سے ناراض رہتا ہے۔ پھر خود کو منالیتا ہے اور مسکراتا ہوا ایک بار پھر آسنے کے سامنے آ بیٹھتا ہے اور اپنے عکس میں دوست کے خدو خال سنوارنے میں مشغول ہوجاتا ہے۔ وہ دوست بناتا ہے اور پھر دوستی کو نبھاتا ہے۔ وہ دشمن بھی بناتا ہے مگر دشمنی پالتا نہیں کیوں کہ اس کی پسند و ناپسند زندہ، رواں دواں پانی کی طرح ہے جو مسلسل صاف ہوتا رہتا ہے، ہر طرح کی آلودگی سے۔

زندگی کے سفر میں ہمارے مسلسل رابطے میں عارضی تعطل بھی آئے اور قدرے طویل وقفے بھی مگر تزلزل کا شائبہ بھی کبھی دوستی کی پائنداری کے نواح سے نہ گزرا۔ مثلاً جب پہلے وہ سلسلہ روزگار سے منسلک ہو کر مصروف ہو گیا۔ پھر میں ملازمت کی پابندیوں کا شکار ہو گیا۔ تاہم اس دوران میں کبھی کسی ادبی تقریب میں اور کبھی خالد علیم صاحب یا طارق کامران کے ساتھ کسی چائے خانے میں آمنا سامنا ہو ہی جاتا اور ہمارے دل بھی ہمارے چہروں کی طرح کھل اٹھتے تھے۔ پھر میں کچھ عرصہ کے لیے ملک دور چلا گیا۔ ریڈیو دو ٹی وی کے لیے جرمی کے لیے جو تین سال میں نے کولون میں گزارے، اس دوران میں بھی علی اصغر سے رابطہ رہا۔ امجد علی اور دوسرے ہم کار اصحاب کے ساتھ ذکر کے ذریعے بھی اور طارق عزیز صاحب کے ماہانہ جریدے میں میرے کالم کے ذریعے بھی، جو

درحقیقت علی اصغر عباس کی ترغیب ہی کے باعث ممکن ہوا تھا۔ لاہور کی ادبی فضا سے ظاہری دوری کے احساس کو کم کرنے کے لیے ہم نے کولون میں ایک تقریب کا اہتمام کیا تو اس میں آسٹریا سے ڈاکٹر جاوید انور بھی شریک ہوا۔ اور جتنے دن وہ کولون ٹھہرا، بلا ناغہ علی اصغر عباس کا ذکر ہوتا رہا۔ فیصل آباد کے شاعر پبلشر کے نام ایک نوجوان شاعر کے ”تاریخی“ شکاقتی پیغام سے لے کر اعجاز رضوی کے ساتھ ٹمپل روڈ پر بیڑھی سے کھانے تک ایک واقعہ یاد آتا گیا۔ اتنے دن گویا کولون میں لاہور بسا رہا۔ ہم دونوں اسے اور اس کی باتوں کو یاد کر کے جی خوش کرتے رہے۔ اور پھر ایک دن فون پر جاوید انور کے انتقال کی خبر سنا کر مجھے اداس بھی علی اصغر عباس ہی نے کیا۔

یوں تو علی اصغر عباس نے بھی پنجابی ادب میں ایم اے کر رکھا ہے اور وہ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا ہے۔ صحافت بھی کرتا ہے مگر نہ تو وہ کسی نام نہاد علمیت کے خول میں مقید ہے اور نہ ہی سیاسی نظریات کے نام پر خواہ مخواہ کی ہٹ دھرمی کا شکار ہے۔ وہ ایک بالغ نظر تخلیق کار کی طرح اپنے ذہن کو، اپنی سوچ کو، اپنی تحریر کو کامکانات کے دھارے پر رواں دواں دیکھنا چاہتا ہے۔ جمود سے پسند ہی نہیں، نہ فکری نہ عملی۔ اس کے کردار کا ایک نمایاں پہلو بے لاگ پن ہے۔ وہ اپنی رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں کتراتا۔ چاہے اسے سخت رد عمل کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس حوالے سے کوئی اسے بدلنا بھی کہہ سکتا ہے۔ ایک دور میں ہم نے دوستوں کے اصرار پر مرنگ مسین نووارد لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کے لیے تنقیدی نشستوں کے انعقاد کا پروگرام بنایا۔ اب اسے اس سلسلے کی ”شامت اعمال“ کہہ لیجئے کہ علی اصغر عباس بھی اس پہلی نشست میں آ نکلا۔ اس نے پیش کی گئی تخلیقات کا کچھ ایسا ”کھرا کھرا“ تجزیہ کیا کہ وہ پہلی نشست ہی آخری ثابت ہوئی۔

سوشل میڈیا کے زور شور نے بھی اس کے مزاج اور اس کی طبعی ترجیحات کو تبدیل نہیں کیا۔ وہ اب بھی بے جھجک وہ سب کچھ کہہ دیتا ہے جو وہ اس وقت محسوس کر رہا ہوتا ہے۔ اس کی دوستی کے معیارات بھی وہی ہیں۔ وہ دوستیاں بناتا ہے، انہیں نبھاتا ہے اور نبھاتا چلا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا تو جمعہ جمعہ اٹھ دن کی بات ہے، اس کی شاعری اور شخصیت کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ نوے کی ابتدا میں جب اس کا اولین شعری مجموعہ ”ہجر نژاد“ شائع ہوا تو اس کا پہلا ایڈیشن برسوں یا مہینوں میں نہیں بلکہ دنوں میں ختم ہو گیا تھا۔ اس بات کی تصدیق مظفر محمد علی صاحب نے خود کی تھی جو ان دنوں جنگ پبلشرز سے منسلک تھے۔ اب تو اس کی شاعری کے کئی مجموعے منصفہ شہود پر آچکے ہیں اور اہل نظر سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

اللہ کریم میرے اس دوست کو عمرِ خضر عطا فرمائے تاکہ وہ اسی طرح لکھتا رہا اور دلوں پر محبت کی

تاریخ رقم کرتا رہے، آمین بہ جاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔ سوچتا ہوں کتنے خوش قسمت ہیں ہم سب دوست جن کو علی اصغر جیسا دوست میسر ہے جو زندگی میں ہمارے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ بیمار پڑ جائیں تو عیادت کرتا ہے۔ دنیا میں نہ رہیں تو اچھے الفاظ میں یاد رکھتا ہے اور دعاے خیر و مغفرت کرتا ہے۔ ہمارے دکھ میں رو رو کر اپنی آنکھیں سُرخ کر لیتا ہے مگر ہمارے خواب میلے نہیں ہونے دیتا۔ اس کے کالموں اور پیغامات سے موصول ہونے والی سائنحاتی اطلاعات، اس کے درد مندانہ حوصلے اور اس کی طبعِ حساس کے حوالے سے میں نے گذشتہ دنوں یہ نظم کہی تھی:

میرے پیارے علی اصغر

اے یارِ من!

تم بُرے تم

بہت ہی بُرے

تم سبھی دوستوں سے محبت بھی کرتے ہو

حیرت ہے،

ان کی وفا، بے وفائی کو بھی جانِ دل سے نبھاتے ہو

ماضی کے قصے سننا

غنودہ دنوں کی تڑپ کو جگاتے ہو

وہ دن کہ راہوں میں جن کی

ابھی تک

غمِ رفتگاں کی مہک گونجتی ہے

وہ سڑکیں، وہ فنٹ پاتھ، انجانی خواہش

مئی کی تمازت، ستمبر کی بارش

شبِ ماہ کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھتوں پر

دکھتی ہوئی شاعری، محفلیں، بے ریا قہقہے

نیم روشن دماغوں کی معصوم نقد و نظر

تازہ ادبی جراید کا باسی سفر

زیر تعمیر غزلیں، ادھورے فسانے

گئے وہ زمانے

کہیں اونگھتے چائے خانوں میں
چائے سے زیادہ مہکتے وہ خود رو مباحث

مہکتی ہوئی بزم یاراں میں تم تھے
مہکتی ہوئی بزم یاراں میں تم ہو
گل بزم یاراں!

کہ بے ساختہ کھلکھلاتے تھے
بے ساختہ کھلکھلاتے ہو
نظمیں سناتے ہو

آتے ہوئے موسموں اور جاتی رُتوں کی
عجب گنگنائی رُتوں کی

کبھی تم مرے خود سے پھڑے ہوئے حرف کو
اور کبھی عارفِ دل شکستہ کی

موج تیر میں ڈوبی ہر اسان نگاہوں کو
جھوٹی ہنسی میں بتاتے ہو:

نبضیں ابھی چل رہی ہیں

گریزاں نفسِ زندگی کی

ابھی وقت کی کوری چادر لپٹنے میں کچھ دیر ہے

شہر زندہ ہے، کہنے کو، رنگین ہے

کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا ہے

اندر سے غمگین ہے

سسکیوں کو حقیقت بناتے ہو

وہ مہرباں خالد احمد، وہ جاوید انور،

اور اب اسلم کولسری اور ناہید شاہد بھی زندہ کہانی ہوئے

اُجلے اُجلے چنبیلی سے آنسو

کسی نیلے رومال میں رکھ کے

□

کندھوں پہ اپنے اٹھاتے ہوسفاک سچ کو
دیے شامِ غم کے جلاتے ہو
لیکن مری لمحہ لمحہ بکھرتی سی
دیوار جاں پر سچی
دھندلی یادوں کی تصویر سے
رنگ کیوں تم چراتے ہو؟
روتے ہو اور دوستوں کو رلاتے ہو
اس دور میں بھی پرانے زمانوں سی یاری نبھاتے ہو
اے یارِ من!
ایسے چپ کیوں کھڑے ہو؟
بتاؤ
تمہیں کیا کہوں؟
تم بڑے ہو
بہت ہی بڑے!!

یہ چند سطور میری اس کی دوستی کے سفر کے مراحل کی جھلکیوں پر مشتمل ہے، علی اصغر عباس کے تخلیقی کارناموں پر بات کرنا باقی ہے۔ اس کا مکمل ادبی کام کبھی مجھے دستیاب ہو گیا تو یہ قرض بھی کما حقہ ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔

فکر و نظر

محسن فارانی

امریکی سپر پاور کے کس بل نکل گئے

امریکہ کے لیبلی صدر ٹرمپ نے کہا ہے کہ ”ہم شام میں ۳ ماہ کے لیے گئے تھے۔ سات سال گزر گئے۔ اب ہم واپس آ رہے ہیں جب کہ داعش کو بڑی حد تک شکست دے دی ہے۔“ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اگلے چند ماہ میں افغانستان سے ۷۰۰۰ فوجی واپس بلانے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ اس امریکی یوٹرن پر خطے میں سترہ اٹھارہ سالہ امریکی مداخلت ذہن میں رکھیے۔ امریکہ نے ابو مادور میں بظاہر شام کے قلبی ڈکٹیٹر بشار الاسد کو محروم اقتدار کرنے کے لیے شام میں پنگالیا تھا جب کہ وہاں ”عرب بہار“ کے زیر اثر بشار کے خلاف عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ امریکہ کا مقصد بشار کا تختہ الٹنا ہرگز نہیں تھا بلکہ مقصود صرف شامی عوامی تحریک کو امریکی کنٹرول میں رکھنا تھا تا کہ خطے میں اسرائیلی مفادات کو نقصان نہ پہنچے۔ اس سے پہلے ۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکی و برطانوی حملے کا مقصد بھی اسرائیلی مفادات کا تحفظ تھا۔ صدر صدام حسین کا اس کے علاوہ کوئی قصور نہیں تھا کہ وہ مظلوم فلسطینیوں خصوصاً ان خاندانوں کی مالی امداد کرتے تھے جن کے افراد اسرائیلیوں کے خلاف خود کش دھماکے کرتے تھے۔ علاوہ ازیں عراق کی دس لاکھ فوج بھی یہود و نصاریٰ کو کھٹکتی تھی، چنانچہ چپ نائن ایون ڈرامے کے تیسرے روز ۱۳ ستمبر ہی کو امریکی صدر ٹرمپ نے مسلم کش کے یہودی نائب وزیر خارجہ پال ولفوٹز نے انھیں عراق پر حملے کی تجویز پیش کر دی تھی جس پر ٹرمپ نے کہا تھا کہ اسے موخر رکھیں کیوں کہ کٹر صلیبی صدر ٹرمپ نے افغانستان پر فوری حملے کا تہیہ کر چکا تھا۔

پھر ڈیڑھ سال بعد یہودی وزیر خارجہ کی تجویز پر عمل درآمد کی نوبت آگئی اور اقوام متحدہ سے اجازت لیے بغیر امریکی و برطانوی افواج عراق پر چڑھ دوڑیں (یاد رہے افغانستان پر امریکی، برطانوی اور فرانسیسی حملے کے لیے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے قرارداد منظور کر کے اجازت دی تھی اور اسے چین نے بھی ویٹو نہیں کیا تھا)۔ ۲۰ مارچ تا ۹ اپریل ۲۰۰۳ء، وحیشتہ فضائی بمباری اور میزائل حملوں سے عراق کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔ ایک فرقے کے جرنیل امریکی فوج کے آگے پسپا ہو گئے تھے۔ یوں ۲۰ روزہ جنگ کا خاتمہ بغداد پر صلیبی افواج کے قبضے کی صورت میں ہوا۔ پھر صدام حسین کو ۱۳ ستمبر ۲۰۰۳ء کو ایک پناہ گاہ سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس سے پہلے ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء کو صدام کے بیٹے قسبی، عذبی اور پوتا مصطفیٰ موصل میں امریکی فوج سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ امریکی فوجی چھتری تلے قائم ہونے والی نوری کامل المالکی حکومت نے ۳۰ ستمبر ۲۰۰۶ء کو

صدام حسین کو پھانسی دے کر شہید کر دیا۔ امریکہ نے ایک پرامن ملک کو تباہ کر کے وہاں فرقہ واریت کا جواز ہریلناج بویا اس کے نتیجے میں ردعمل کی تحریک داعش کی شکل میں اٹھی جس نے پورے خطے کو لپیٹ میں لے لیا۔ اس دوران میں ستمبر ۲۰۱۵ء میں روسی افواج بشار کی مدد کے لیے آ پہنچیں اور امریکہ داعش کے استیصال میں مصروف ہو گیا۔ اب امریکہ جس داعش سے جان چھڑا کر شام سے بھاگ رہا ہے، اس کے جنم لینے کا ذمہ دار امریکہ ہی تو ہے۔ امریکی مصنف و محقق لیری ڈائمنڈ نے اپنی کتاب ”ضائع شدہ فتح: امریکی قبضہ اور عراق میں جمہوریت لانے کی مضحکہ خیز کوشش“

(Squandered Victory: The American Occupation and the Bungled Effort to bring Democracy in Iraq)

میں عراق میں امریکی ناکامی کی المناک رواد بیان کی ہے، وہ ناکامی جسے صدر ٹرمپ نے امریکی بحری جنگی جہاز پر کیم مئی ۲۰۰۳ء کو کھڑے ہو کر The Mission Accomplished (مشن مکمل ہوا) کا نام دیا تھا۔

صلیبی جنگجو ٹرمپ نے ”میشن مکمل ہوا“ آج سترہ سال بعد بھی ادھورا ہے۔ عراق میں تو وہ فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوادے کر چلتے بنے، مگر افغانستان میں ان کی صلیبی جنگ بدترین ناکامی سے دوچار ہے۔ برطانوی نشریاتی ادارے کی رپورٹ کہتی ہے کہ ”افغانستان میں متحارب گروپ طالبان کے ۶۰ ہزار جنگجو موجود ہیں اور ۲۰۰۱ء میں اقتدار سے ہٹائے جانے کے بعد اس وقت بھی افغانستان کے سب سے زیادہ علاقے پر ان کا کنٹرول ہے۔ رپورٹ کے مطابق امریکہ کی جانب سے افغان حکومت کو فوجی و مالی امداد ملنے کے باوجود یہ جنگ زیادہ شدید اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔ اتنے طویل عرصے تک بغاوت کو قائم رکھنے کے لیے ملک کے اندر اور باہر دونوں جانب سے بہت زیادہ فنڈنگ کی ضرورت ہوتی ہے جو انھیں یقیناً میسر ہے۔“

دراصل بدبھاد امریکی طالبان کے جذبہ جہاد اور قوت مزاحمت کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ بلا ٹوش جارج واکر ٹرمپ اور اس کے یار برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر نے اگر برصغیر اور افغانستان کی تاریخ پڑھی ہوتی تو وہ جان لیتے کہ انیسویں صدی کی سپر پاور برطانیہ ۱۸۳۹ء تا ۱۸۷۸ء اور ۱۹۱۹ء میں تین خونریز اینگلو افغان و ارز میں کیوں کر ناکام رہا تھا۔ ۱۸۴۱ء میں افغانیوں نے سولہ سترہ ہزار برطانوی فوج کی کابل سے پسپائی کے دوران میں اس کا تینوں بیٹروں کی طرح شکار کیا اور صرف ایک برائینڈن نامی انگریز خستہ حال میں زندہ جلال آباد پہنچ پایا تھا۔ اور لاکھوں روسی افواج کی افغانستان سے شرم ناک پسپائی تو ۱۹۸۰ء کی دہائی کی بات ہے۔ اس پر بھی بددماغ امریکی برطانوی صلیبی گورے سمجھنے پائے اور امریکہ جس طرح افغانستان کی دلہل میں آ پھنسا، اس پر چند سال بعد ہی مغربی صحافیوں نے افغانستان کو ”سلطنتوں کا قبرستان“ کہنا شروع کر دیا تھا۔

فانوس نما

محمد شکور طفیل

جنرل ”ٹائیگر نیازی“ سے جنرل ”انور نیازی“ تک

مشرقی پاکستانی کی ہم سے جدائی کے پس منظر میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما رہے ہیں، وہیں ہماری فوج کے کمانڈر جنرل ”ٹائیگر نیازی“ کی ناقص عسکری کارکردگی اور مقامی بنگالی باشندوں کے ساتھ ان کے منفی رویے کو بھی خاص عمل دخل رہا ہے۔ ہماری قوم نے اس مشکل گھڑی میں اُسے ڈھا کہ میں ٹائیگر بنا کر بھیجا تھا، دنیا بھر میں اُس کی شجاعت و بہادری کی دھوم مچی ہوئی تھی لیکن افسوس صد افسوس کہ سول معاملات میں یہ عسکری مداخلت ہمیں اتنی مہنگی پڑی کہ ڈھا کہ کے کھلے میدان میں ہمارے ۰۹ ہزار سپاہیوں اور شہریوں کو ہندو تینے کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

خیر یہ تو ایک بڑا طویل اور دردناک موضوع ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارے ہر عسکری مصنف نے جنرل نیازی کی نااہلی کا رونا رویا ہے، اُس کی بد عملیوں پر اُٹھائیاں اُٹھائی ہیں اور اس کی بنگالیوں کے ساتھ بد سلوکی پر ماتم کیا ہے۔ آخر میں رہی سہی کسر ”حمید الرحمن کمیشن رپورٹ“ نے جنرل نیازی کے اس غیر پروفیشنل رویے کا پردہ چاک کر کے پوری کر دی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اس جنرل نے، جو ڈھا کہ میں کیا، اب وہی کچھ ”جنرل“ انور نیازی ملک کی انتہائی محب وطن جماعت یعنی جماعت اسلامی کے ہیڈ کوارٹرز منصورہ میں کر رہے ہیں۔ ان دونوں ”جرنیلوں“ میں خاص قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ اگر جنرل ٹائیگر نیازی ڈھا کہ کے میدان میں لڑنے کے قابل نہ تھے تو ”جنرل“ انور نیازی جماعت اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت کے میدان میں مکمل طور پر نااہل ثابت ہوئے ہیں۔ جس طرح جنرل ٹائیگر نیازی بنگالی عوام اور بنگالی سپاہیوں کی سرعام تہلیل کیا کرتے تھے بالکل اسی طرح ”جنرل“ انور نیازی منصورہ میں ہر باصلاحیت شخص کو اپنے راستے سے ہٹانے کے منصوبے پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ خود کم علم ہیں اور زیادہ علم والے کو ہمیشہ اپنی نوکری کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔ وہ نہ تو خود صحافی ہیں اور نہ ہی ادیب، لہذا وہ ہر پڑھے لکھے نوجوان کو اپنے روزگار کا دشمن سمجھتے ہیں۔ جنرل ٹائیگر نیازی کی طرح ان کے اندر بھی غرور و تکبر اور رعوت پائی جاتی ہے اور گردن ہر وقت اکڑی نظر آتی ہے۔ جو انکسار اور ملنساری کبھی جماعت اسلامی کے بزرگ

غالباً ۲۰۰۸ء کی بات ہے۔ پاک افغان سرحد پر کوہ سفید کی پہاڑی پر کھڑے ایک طالبان کمانڈر نے ایک امریکی صحافی کی کلائی سے بندھی قیمتی گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا: ”گھڑیاں تمہارے پاس ہیں، وقت ہمارے پاس ہے۔“ یوں طالبان نے وقت کو طول دے کر امریکی سپر پاور کو دھیرے دھیرے جو زخم لگائے ہیں ان سے صلیبی خون رستا چلا جا رہا ہے۔ وقت امریکیوں کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ شرمناک رسوائی اور پسپائی ان کا مقدر ہے۔ طالبان سے مذاکرات کی بھیک مانگتے مانگتے امریکیوں کی حالت قابل رحم ہو چکی ہے۔ پاکستان کو دھمکیاں دینے والا ٹرمپ خاموش ہو کر اب پاکستان سے ”امریکہ افغان طالبان مذاکرات“ کی کامیابی کی امید لگائے ہوئے ہے۔ ادھر ایران کے ایڈمرل حبیب اللہ سیاری نے کہا ہے کہ ”خلیج فارس میں پہنچنے والے امریکی بیڑے سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ امریکیوں میں اتنی ہمت و طاقت نہیں کہ وہ ہمارے خلاف کوئی اقدام کریں، تاہم اگر امریکہ کسی قسم کی جارحیت کا مرتکب ہوا تو ہم جوابی کارروائی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔“

ڈونلڈ ٹرمپ بزنس مین ہے۔ وہ ٹیکساس کے ”تیلی“ جارج بٹس کے برعکس کچھ نفع نقصان کا شعور رکھتا ہے۔ اس نے شام سے پلا اٹھا لیا ہے جب کہ صدارتی الیکشن (۲۰۱۶ء) سے پہلے ہی وہ عراق پر امریکی حملے (۲۰۰۳ء) کو حماقت قرار دیتا رہا تھا۔ ایک پادری کی ترکی میں گرفتاری اور ترک صدر اردوان کے مخالف، واشنگٹن میں براہمان فتح اللہ گولن کی حوالگی کے معاملات میں انقرہ واشنگٹن تعلقات کشیدہ تھے۔ لیکن اب ٹرمپ کی ترک صدر سے گاڑھی چھننے لگی ہے۔ شام سے امریکی فوج کے انخلاء کی دستاویز پر دستخط کرنے کے بعد ٹرمپ نے ترک صدر جب طیب اردوان کی ستائش کی ہے۔ انھوں نے ترک ہم منصب کوفون کر کے کہا ہے کہ ”ہم اپنا کام کر چکے ہیں۔ اب شام آپ کے حوالے۔ آپ ہی وہ شخص ہیں جو داعش کا خاتمہ کر سکتے ہیں۔“ ٹرمپ کے بقول شام سے امریکی فوج رفتہ رفتہ واپس بلائی جائے گی۔ امریکی صدر نے امید ظاہر کی ہے کہ امریکی دستوں کے انخلاء کے بعد صدر اردوان دہشت گرد تنظیم داعش کے خلاف جنگ تیز کر دیں گے۔ دوسری طرف امریکی اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے بعض عناصر شام اور افغانستان سے انخلاء پر ٹرمپ سے سخت ناراض ہیں۔ امریکی وزیر خارجہ جنرل جیمز میٹس نے جو افغانستان کی جنگ میں حصہ لے چکے ہیں، استعفاء دے دیا ہے اور شام کے لیے امریکی خصوصی نمائندہ جیمز فرینکلن جیمز بھی مستعفی ہو چکا ہے۔ لیکن ٹرمپ دھن کا پکا ہے، وہ امریکی سپر پاور کی رہی سہی عزت کو بچانے کی فکر میں ہے۔ دیکھیے وہ افغانستان سے مکمل فوجی انخلاء کا فیصلہ کب کرتا ہے۔

صحافیوں اور شعبہ نشر و اشاعت کے ماضی کے کارکنوں، جیسے ملک نصر اللہ خان عزیز، غلام جیلانی، اسد گیلانی اور جناب صفدر چودھری میں پائی جاتی تھی، وہ انکسار اور ملنساری ”جزل“ انور نیازی میں مکمل طور پر مفقود ہے۔ یاد کریں مولانا مودودیؒ کی اُس چھوٹی سی جماعتِ اسلامی کو، جس کا شعبہ نشر و اشاعت کبھی آج کی جماعتِ اسلامی سے کئی گنا بڑا، مؤثر اور منظم ہوا کرتا تھا۔ اُس دور کے شعبہ نشر و اشاعت کے ذمہ داران سادگی اور ملنساری کے چلتے پھرتے نمونے ہوتے تھے۔ اُن کے ہاں محبت اور خلوص کا دریا بہتا تھا۔ وہ ہر صحافی، ادیب اور شاعر سے رابطہ رکھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ ماہ نامہ ”ترجمان القرآن“ لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب نعیم صدیقی ہوں یا ماہ نامہ ”آئین“ لاہور کے مدیر اعلیٰ جناب مظفر بیگ، یا پھر ہفت روزہ ”تکبیر“ کراچی کے مدیر اعلیٰ جناب صلاح الدین نوجوانوں کے لیے ایک روشن مثال ہوا کرتے تھے اور اب بھی ہیں۔ مولانا مودودیؒ کے افکار نے الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمن شامی، عطا الرحمن، رؤف طاہر اور عرفان صدیقی جیسے بڑے صحافیوں اور دانشوروں کو جنم دیا، جب کہ صفِ دوم میں ان کے شاگردوں، وابستگانوں اور متاثرین کی تعداد ہزاروں میں ہے۔

اب دیکھتے ہی دیکھتے ایسا کیا ہوا کہ قاضی حسین احمد اور خرم مراد کی ”اسلامی فرنٹ“ اور ”پاسبان“ کو قائم رکھنے کی ضد نے جماعتِ اسلامی کی اس ساری صحافتی طاقت کو طبلِ جنگ بجانے پر مجبور کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قاضی صاحب کو آخر تک نعرے باز نوجوانوں کے ایک بڑے حصے کی حمایت حاصل رہی مگر جماعتِ اسلامی سے سال ہا سال سے وابستہ صحافی، ادیب اور شاعر کھلم کھلا بغاوت پر اتر آئے اور خاص طور پر ۱۹۹۱ء کے انتخابات میں انھوں نے جماعتِ اسلامی کے بجائے نواز شریف کی مسلم لیگ کو اپنے وٹوں سے نوازا۔ یوں وقت نے یہ ثابت کر دیا کہ سابق امیر جماعتِ جناب میاں طفیل محمد کی یہ بات بالکل درست تھی کہ ”مسلم لیگ جماعتِ اسلامی کی ایک فطری اتحادی جماعت ہے“۔ ماضی میں میاں صاحب پر غصہ نکالنے والے آج ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ غور فرمائیں کہ اسلامی فرنٹ نے آپ کو کیا دیا؟ پھر متحدہ مجلس عمل میں جمعیتِ علمائے اسلام کے روکھے پن سے آپ کو کیا حاصل ہوا؟ بعد ازاں تحریکِ انصاف کے عمران خان نے آپ کو اپنا مطلب پورا ہونے پر کیسے گھڈے لائن لگایا؟ صرف ایک نواز شریف جیسا شریف آدمی ہی آپ کو ملا تھا جس کے سامنے ہر ضروری اور غیر ضروری مطالبہ آپ منہ پھاڑ کر کرتے رہے؟ کبھی قاضی صاحب نواز شریف سے وزارتِ عظمیٰ مانگتے رہے اور پھر کبھی ۲۰۱۰ء کے انتخابات سے قبل مسلم لیگ کی قیادت کے ساتھ مذاکرات کرتے ہوئے جناب میاں مقصود احمد اور جناب امیر العظیم بلاوجہ اپنی اوقات سے زیادہ

نشستیں مانگ کر مذاکرات کو سبوتاژ کرتے رہے۔ ان دنوں جماعتِ اسلامی کی سیاسی ساکھ سے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مسلم لیگ نے جن نشستوں کی جماعتِ اسلامی کو آفر کی تھی، وہ بالکل درست تھی۔

جماعتِ اسلامی کی اس اندرونی کشمکش کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ شعبہ نشر و اشاعت میں کسی غیر جانب دار شخص کی تعیناتی کی جاتی مگر بد قسمتی سے جناب امیر العظیم کو یہ ذمہ داری سونپ دی گئی، جو کہ مکمل طور پر قاضی صاحب کی وفاداری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لہذا اُن کا خلوص اور تہ سربہ اپنی جگہ مگر وہ فطری طور پر قاضی صاحب سے اختلاف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا وہ عام طور پر بڑے ہولٹوں میں حسن نثار، نذیر ناجی اور عباس اطہر جیسے سیکولر صحافیوں ہی کو ”تبلیغ دین“ کا فریضہ انجام دیتے رہے اور جماعت سے وابستہ صحافیوں، ادیبوں اور شاعروں کو انھوں نے ہمیشہ باغی اور کمتر سمجھتے ہوئے نظر انداز کیا۔ یوں اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اُن کا اس شعبہ میں کامیاب ہونا ممکن نہ تھا۔ اس ساری صورتِ حال کی وجہ سے ایک ایسے نااہل شخص کو اوپر آنے کا موقع مل گیا جن کی کل خوبیاں صرف یہی تھیں کہ وہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق دائرہ داری رکھے ہوئے تھے، پانچ وقت نماز کے بڑے پابند اور اپنی نوکری قائم رکھنے کے لیے صرف متعلقہ افراد کی چالوسی کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ باقی عام لوگوں سے ملنا، سلام کرنا اور اُن کے کسی کام آنا ان کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ۷۰ سال کا ہو جانے کے باوجود کسی کے اندر یہ ہمت نہیں کہ انھیں ریٹائر کرنے کا سوچ بھی سکے۔ لہذا وہ منصورہ شریف میں پورے طنطنے سے یوں بے فکر ہو کر گھوم رہے ہوتے ہیں جیسے وہ واقعی کوئی ”جزل“ نما چیز ہوں اور جیسے وہ اپنی تابع فرمان سپاہ کا معائنہ کرنے نکلے ہوں۔

اس ”جزل“ انور نیازی کے ہاتھوں اسلامی جمعیتِ طلباء کے بیسیوں متاثر اور تجربہ کار نوجوان ضائع ہو چکے ہیں۔ انھی نوجوانوں میں سے ایک اہم نوجوان جناب ندیم سرور بھی ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں ایم۔ اے صحافت کی ڈگری ہے اور دوسرے ہاتھ میں شعبہ نشر و اشاعت کا وسیع عملی تجربہ بھی۔ منصورہ سے اس ”جزل“ نے اس نوجوان کو بھی اپنی کمال بزرگی اور مہارت سے فارغ کرا دیا اور خود باقاعدگی سے پوری تنخواہ وصول کر رہے ہیں۔ اس ندیم سرور کو جماعتِ اسلامی کا کون سا بڑا اور چھوٹا رہنما نہیں جانتا؟ جمعیت اور جماعت کا ہر رہنما اور کارکن اُن کی ایمان داری اور اعلیٰ کارگزاری کو بخوبی جانتا ہے۔ ان دنوں جماعتِ اسلامی ایک کمیٹی تشکیل دے کر اپنی انتخابی شکست کی وجوہات تلاش کر رہی ہے۔ تو جناب والا! آپ کی انتخابی شکست کی وجوہات بیرونی کم اور اندرونی زیادہ ہیں۔ کاش کہ کسی گمشدہ گائے کی طرح جگہ جگہ اس چرنے کے بجائے جناب میاں طفیل محمد کی اس بات کو پلٹے

باندھ لیا ہوتا کہ ”مسلم لیگ جماعت اسلامی کی فطری اتحادی جماعت ہے“۔ اگر جماعت اسلامی نے اس بات کو سمجھ لیا ہوتا تو آج لیاقت بلوچ، حافظ سلمان بٹ، فرید احمد پراچہ اور میاں مقصود احمد صاحب جیسے تجربہ کار رہنما یوں لاہور میں ٹاک ٹوئیاں نہ مار رہے ہوتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا بے داغ ماضی اور سیاسی تجربہ قوم کا ایک اہم اثاثہ ہے۔ قوم کو ایسے ہی مخلص، بے داغ اور سیاسی تجربہ رکھنے والے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو انکسار اور ملنساری میں اپنی مثال آپ ہیں۔ کاش کہ شعبہ نشر و اشاعت میں بھی ایسے تجربہ کار اور غیر جانب دار صحافیوں کو اوپر لایا جائے جو سادگی، انکسار اور ملنساری کا اعلیٰ مرتبہ ہوں۔ جماعت کے امیج کو اُجاگر اور صحافیوں میں اپنے روابط کو وسیع کرنے کے لیے جناب ندیم سرور سب سے بہترین چناؤ ہو سکتے ہیں۔ جناب سراج الحق صاحب، جناب سید منور حسن، حافظ محمد ادریس اور جناب امیر العظیم صاحب انھیں ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ جس شخص نے کبھی کوئی اختلاف نہیں کیا، کسی کے خلاف کبھی کوئی زبان نہیں کھولی اور جو اب بھی انور نیازی کے بارے میں ہر وقت کلمہ خیر کہتا ہے، ایسا چلتا پھرتا ہیرا ایک زندہ لاش بن کر اب بھی جماعت اسلامی زندہ باد کا نعرہ لگا رہا ہے۔ میں کئی ماہ سے یہ کالم لکھتے ہوئے رہ جاتا تھا مگر اب کی بار دہی واپسی پر میں نے جماعت اسلامی کے اس ہیرے کو جس حال میں دیکھا، اس کے بعد میں یہ کالم لکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کے لیے میں جناب سراج الحق اور جناب اظہر اقبال حسن سے پیشگی معافی کا خواست گار ہوں۔



اقبال نمبر (۲)

انشاء اللہ

ماہ اپریل میں شائع ہو کر آ رہا ہے

- | | | |
|----|---|-------------------------|
| 1 | کلام اقبال میں قرآنیات | پروفیسر ابوسفیان اصلاحی |
| 2 | اقبال، جمال الدین افغانی اور اتحاد عالم اسلامی کی تحریک | ڈاکٹر خالد اقبال یاسر |
| 3 | اقبال کا پاکستان | جلیل عالی |
| 4 | خطوط اقبال بنام قائد اعظم | صفا خان |
| 5 | ۱۹۷۳ء کا آئین — فکر اقبال کے آئینے میں | محمد شکور طفیل |
| 6 | صوفی تبسم کے قلم سے ”ایک پہاڑ اور گلہری“ کا | |
| 7 | غیر مطبوعہ منظوم پنجابی ترجمہ | ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد |
| 8 | علامہ اقبال کے جغرافیائی تصورات و علامات | محسن فارانی |
| 9 | ماہ نامہ ”فانوس“ کا اقبال نمبر (۱) — ایک نظر میں | خورشید بیگ میلسوی |
| 10 | ”بانگِ درا“ کے بعد علامہ اقبال کی غزل کا تخلیقی آہنگ | خالد علیم |
| 11 | اقبال کی نذر (منظوم خراج عقیدت) | سلیم کوثر |
| 12 | بیاد اقبال (منظوم خراج عقیدت) | جلیل عالی |
| 13 | اقبال کے حضور فارسی نظم | ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد |
| | تضمینات برکلام اقبال | خالد علیم |

سالانہ ممبر شپ لینے پر یہ شمارہ بالکل مفت دیا جائے گا